رجسٹرڈ نمبر ۱۔ ۴۶۶

قیمت فی کاپی ۸ر

نگار

چندہ سالانہ صہ،

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۴۳	فہرست مضامین مارچ سنہ ۴۳ء	شمار ۳

ملاحظات ---------- ۲
روح و بقاء روح ---------- ۳
کلیاں ---------- ابراہیم جلیس (بی۔اے) ---- ۷
ریاض اور ہم ---------- آل احمد سرور ---------- ۱۰
دوری ---------- مجتبیٰ حسین ---------- ۱۸
دو دن دارالسرور رامپور میں ---------- ۲۲
مکتوبات نیاز ---------- ۲۴
باب الاستفسار ---------- ۲۶
مطبوعات موصولہ ---------- ۲۸
منظومات ---- اثر - شعور - کاوش - اشرف نخشب
فراق - شاطر - عابد
بقیہ ملاحظات ----------

فروری ۴۳ء کا نگار جنوری ۴۳ء کے نگار کے ساتھ شامل تھا۔ علٰحدہ شایع نہیں ہوا

ملاحظات

کاغذ کال

دُنیا میں اپنی قسم کا یہ بالکل پہلا کال ہے جسے صرف تمدن جدید ہی پیدا کرسکتا تھا اور اس کی دوسری برکات کے ساتھ ہمیں اسے بھی برداشت ہی کرنا ہے ۔ ایک طرف پروپاگنڈا اور دوسری طرف وسایل جنگ کی وسعت ۔ ان دونوں نے حکومت کے "کاغذی مصارف" کو بہت بڑھا دیا ہے اور ظاہر ہے کہ ان ضرورتوں کے سامنے پبلک کا مطالبہ کیونکر پورا کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اخبارات و رسایل کے لئے جتنا کاغذ پچھلے سال منظور کیا گیا تھا، وہ سال رواں میں ۵۰ فیصدی کم کر دیا گیا۔

یقیناً اس خلفشار میں بہت سے اخبارات و رسایل بند ہو جائیں گے اور جو بعض جاری رہیں گے ان کو اپنا حجم بہت کم کر دینا پڑے گا۔ چنانچہ ہم کو بھی حجم میں چار صفحات کی کمی کرکے مسطر پھر گنجان کرنا پڑا۔ اور دسمبر ۴۲ء کے نگار میں جو اعلان اضافۂ حجم اور وضاحت مسطر کے متعلق کیا گیا تھا اس پر عمل نہ کرسکے۔ لیکن جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا تھا، یہ تمام باتیں عارضی ہیں اور شاید جنگ کی کمی کے بعد، نگار پھر ۸۰ صفحات کے کشادہ مسطر پر شایع ہوگا۔

کتابوں اور خاص نمبروں کی قیمت میں اضافہ

کاغذ کی نایابی کی وجہ سے نگار کو جو ناقابل تلافی نقصان پہونچ رہا ہے، اس کا تعلق رسالہ سے اتنا نہیں، جتنا کتابوں سے ہے۔ نگار کی تقریباً تمام مطبوعات ختم ہوگئی ہیں اور ضرورت تھی کہ نہ صرف یہ بلکہ بعض جدید کتابیں بھی جلد سے جلد شایع کر دیجاتیں، لیکن فی الحال اس کا کوئی امکان نہیں اور اسی لئے ہم کو موجودہ اسٹاک کی کمی کی وجہ سے قیمتوں میں اضافہ کرنا پڑا۔ اس کی وضاحت اس لئے ضروری ہے کہ جو حضرات کتابیں یا نگار کے بعض خاص نمبر طلب فرمائیں وہ اضافہ شدہ قیمتوں کو ضرور سامنے رکھیں۔ ان میں رعایت وغیرہ کا سوال اُٹھا کر ہمیں شرمندہ کرتا ہے۔

اس ماہ کے رسالہ میں کسی جگہ نگار کے خاص نمبروں کی قیمت شایع ہوئی ہے، لیکن وہ صحیح نہیں ہے، خط لکھ کر دفتر نگار سے دریافت کیا جائے۔

الجودی والقرآن

افسوس ہے کہ کاغذ کی کمی کی وجہ سے ہم اس سلسلہ کو پورا نہیں کرسکتے جس کا آغاز "الجودی والقرآن" کے عنوان سے دسمبر ۴۲ء میں کیا گیا تھا۔ چونکہ یہ مقالہ ایک بسیط تصنیف کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کم از کم ایک سال تک اس کا سلسلہ جاری رہتا اور بجائے موجودہ ہم ہر مہینے ۸ صفحات اس کے لئے وقف نہیں کرسکتے۔

آیندہ اشاعتوں کے بعض اہم مضامین

آیندہ اشاعتوں میں آپ بعض نہایت اہم مضامین ملاحظہ فرمائیں گے۔ ادبی حیثیت سے قابل ذکر ایک مشہور ترک مصنف کا ڈرامہ ہے جس کا ترجمہ سید سجاد حیدر یلدرم نے نگار کو مرحمت فرمایا ہے۔ ترکی لٹریچر کی نزاکت اور سید صاحب کا ترجمہ دونوں اپنی اپنی جگہ اس کی خوبی کے ضامن ہیں۔ انتقادی سلسلہ میں ایک مقالہ جناب حبیب احمد صدیقی ام۔ اے کا جس میں غالب کے فارسی تغزل کے متعلق سید امداد امام اثر کی رائے پر فاضلانہ اظہار خیال کیا گیا ہے، دوسرا مقالہ "اقبال کے فلسفہ و شاعری" پر سید ارتضیٰ حسین صاحب ام۔ اے کا تیسرا مقالہ "مکتوبات شاد عظیم آبادی پر ایک نظر" سید نادر مرزا ام۔ اے کا اور چوتھا مولانا باقر شمس لکھنوی کا اُردو تغزل پر غالباً قابل توجہ ثابت ہوں گے۔ ان کے علاوہ دوسرے حضرات کے مضامین بھی جو کافی دلچسپ و مفید ہیں نگاہ سے گزریں گے۔

جنگ کا دوسرا معجزہ

اب کوئی پیغمبر دُنیا میں آئے یا نہ آئے، لیکن معجزے اب بھی کبھی کبھی دیکھنے میں آجاتے ہیں اور پچھلے چار سال کے اندر دو بار ان کا ظہور ہوا۔ ایک کا آغاز ستمبر ۳۹ء سے ہوا جب ہٹلر کی فوجوں نے دُنیا سے یہ بات منوا کر چھوڑی کہ ناتسی فوج نام ہے ایک ایسی قوت کا جو ہارنے کے لئے پیدا ہی نہیں ہوئی اور فتح و نصرت اس کے گھر کی کنیز ہے ——— اور دوسرے معجزہ کا ظہور ۱۹ نومبر ۴۲ء کو ہوا جب روسی فوجوں نے اپنا جوابی حملہ شروع کیا اور تین مہینے کی قلیل مدت میں تین سال کے ناتسی ساکھ کو اس طرح خاک میں ملا دیا ——— گویا کہ اُن کے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا!

(سلسلہ کے لئے ملاحظہ ہو صفحہ ۳۸)

رُوح و بقاءِ رُوح

سائل

(علمی و اسلامی نقطۂ نظر سے)

مذہبی و علمی دُنیا کے درمیان یوں تو بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں، لیکن ان تمام اختلافات کی بنیاد مذہب کے صرف مابعد الطبیعی عقاید ہیں۔ یا زیادہ صاف الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر اہلِ مذہب بقارِ روح و حیات بعد الموت سے انکار کردیں یا اہلِ علم اس کے قایل ہو جائیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا

مذہب والے کہتے ہیں کہ موت، زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ ابتدا ہے دوسری زندگی کی یعنی جس طرح اس عالم آب و گل میں ایک انسان اپنی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کا تشخص باقی رہیگا، کیونکہ روح غیر فانی ہے اور اسی کے ماننے یا نہ ماننے کا نام مذہب و لامذہبیت ہے

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ بقارِ روح یا حیات بعد الموت کا عقیدہ دُنیا کے مذہبی دور کی پیداوار ہے یا اس سے پہلے کی اور اسکا جواب تاریخ انسانی کے مطالعہ کے بعد ہم کو یہ ملتا ہے کہ مذاہب الہامی کے ظہور سے بہت پہلے جب انسان جہل و تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا، یہ عقیدہ پایا جاتا تھا اور مذاہب عالم نے اس میں کوئی تبدیلی ایسی نہیں کی جو الہام خداوندی کے بغیر ناممکن ہوتی یا جس کے ثبوت میں کسی ربانی دلیل کی ضرورت لاحق ہو۔ اس لئے اگر لامذہب جماعت اس عقیدہ کی مخالف ہے تو دراصل یہ مخالفت مذاہب کی نہیں بلکہ انسان کے تاریک دور کے ایک خیال کی مخالفت ہے — اور — اگر اہلِ مذاہب یہ کہنے کے لئے طیار نہیں کہ عہدِ قدیم کے انسان کا یہ عقیدہ بھی الہامی تھا تو پھر عہد تاریک کے اس عقیدہ کو بدستور قایم رکھنے کی ذمہ داری اہلِ مذاہب ہی پر عاید ہوتی ہے اور وہی اس کے جوابدہ ہیں

ابتدار آفرینش میں انسان کا علم و تجربہ دونوں بہت محدود تھے، وہ کائنات کے ہر ہر طبعی حادثہ کو دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا اور اپنی کوتاہ عقل کے مطابق اسکے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا۔ دنیا کے حوادث میں سب سے پہلا اور اہم حادثہ جس سے اس کو دوچار ہونا پڑا غالباً اس کی اولاد یا دوسرے عزیزوں کی موت کا رہا ہوگا۔ اول اول تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہوگا کہ جیتا جاگتا، چلتا پھرتا انسان کیوں اور کہاں چلا گیا، لیکن جب اس کے واہمہ نے خواب میں اس کو پھر زندہ دکھایا ہوگا تو اس نے خیال کیا ہوگا کہ آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی وہ زندہ ہے اور یہیں سے نہ صرف بقارِ روح بلکہ حیات بعد الموت کے عقیدہ کی ابتدا ہوتی ہے جو اس وقت بھی مذاہب عالم میں اساس کی حیثیت رکھتا ہے

اس عقیدہ کا دوسرے الفاظ میں یہ مفہوم قرار پاتا ہے کہ روح زندگی سے مختلف چیز ہے، اور وہ زندگی ختم ہونے کے بعد بھی پائی جاتی ہے، حالانکہ علمی تحقیق سے زندگی کی جو حقیقت دریافت ہوئی وہ اس خیال کی تردید کرتی ہے

تمام اونچے درجہ کی حیوانی زندگی صرف ایک خلیہ (Cell) سے شروع ہوتی ہے۔ یہ خلیہ دوسرے خلیہ سے ملتا ہے اور پھر ان سے اور بہت سے خلایا پیدا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک خاص صورت کا حیوان شکل پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی تمام حیوانی زندگی کے دوران میں کروروں بلکہ اربوں خلایا اس کے جسم میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں یہاں تک کہ بیماری یا کہولت یا کسی حادثہ کی وجہ سے یہ خلایا بیکار ہو جاتے ہیں اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خلایا میں روح ہوتی ہے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جس وقت استقرارِ حمل ہوتا ہے تو ماں کی طرف سے کم از کم دس ہزار خلایا اور باپ کی طرف سے اربوں خلایا کام کرنے کے لئے حرکت میں آجاتے ہیں لیکن ان میں صرف ایک دو خلایا انسانی زندگی کا باعث ہوتے ہیں اور باقی سب ضایع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر خلایا یا جراثیم میں بھی روح کا وجود تسلیم کیا جائے گا تو کائنات میں روحوں کی تعداد غیر محدود تسلیم کرنا پڑے گی، علاوہ اس کے اگر روح کو حیات سے علیحدہ کوئی چیز دوسری مانیں گے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ انسان میں وہ روح کب، کیونکر اور کہاں سے داخل ہوئی اور جسم سے جدا ہو جانے کے بعد وہ کہاں چلی جاتی ہے

اس سے پہلے جب علم طب نے زیادہ ترقی نہ کی تھی تو ایک مُردہ بچہ پیدا ہونے پر اسے دفن کر دیا جاتا تھا اور اس طرح ڈوبنے کے بعد جب انسان بیجان ہو جاتا

توہم بھی سپرد خاک کر دیتے تھے، لیکن اب بعض صورتوں میں بجلی یا دوسرے ذرائع سے ان کے ساکن قلب میں حرکت پیدا کر دی جاتی ہے اور زندگی عود کر آتی ہے۔ اگر ہم روح کے وجود کو زندگی سے علٰحدہ تسلیم کر لیں گے تو ان صورتوں میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ مُردہ روح کیا کہیں قریب ہی منڈلا رہی تھی جان کے جسموں میں داخل ہو گئی اور اگر ایسا ممکن تھا پھر وہ بغیر طبی ذرائع اختیار کئے ہوئے از خود کیوں نہ آ گئی۔ اگر یہ کہا جائے کہ ہم جس چیز کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں وہی دراصل روح ہے تو پھر حشرات و نباتات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا کیونکہ زندگی سے وہ بھی خالی نہیں ہیں، حالانکہ اہل مذاہب سوائے انسان کے کسی اور جاندار میں روح کا وجود تسلیم نہیں کرتے

بہرحال اہل مذاہب کا یہ عقیدہ کہ روح زندگی یا حیات سے علٰحدہ کوئی ایسی چیز ہے جو فنا نہیں ہوتی، اہل علم کے نزدیک قابل تسلیم نہیں اور اس اعتراف و انکار کے سلسلہ میں مذہب کی طرف سے کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جاتی اور اہل علم انکار کے بہت سے دلایل اپنے پاس رکھتے ہیں مثلاً:

۱۔ اگر روح غیر فانی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قدیم ہے یعنی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی، کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ ایک چیز کی انتہا نہ ہو، لیکن ابتدا ہو، وجود کا ایک سرا اگر محدود ہے تو دوسرا بھی یقیناً محدود ہوگا، اس لئے روح کو غیر فانی کہنا گویا اسے واجب الوجود تسلیم کرنا ہے، حالانکہ یہ صفت صرف خدا کو حاصل ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں

۲۔ اگر روح، حیات سے علٰحدہ کوئی چیز ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہے کہ وہ کس وقت جسم انسانی میں داخل ہوتی ہے۔ آیا اسی وقت جب نطفہ، رحم مادر میں قرار پاتا ہے یا اس کے بعد کسی اور زمانہ میں۔ اگر استقرار حمل کے وقت ہی کو آمدِ روح کا اولین لمحہ قرار دیا جائے تو چونکہ روح کو صاحب شعور و ادراک کہا جاتا ہے اس لئے جنین کو رحم مادر کے اندر بھی صاحب شعور و ادراک ہونا چاہئے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ اور اگر آمدِ روح کا کوئی اور وقت مقرر کیا جائے گا تو پھر اس تعیین کے کیا اصول ہوں گے جبکہ شعور و ادراک کے مسئلہ میں تمام انسان یکساں نہیں ہیں ——— کسی میں شعور و ادراک بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے کسی میں بہت دیر کے بعد، کسی کا حافظہ ابتدا ہی سے قوی ہوتا ہے اور کسی کا آخر عمر تک ضعیف رہتا ہے، اور جو دیوانے پیدا ہوئے ہیں ان میں آخر عمر تک شعور و ادراک پیدا نہیں ہوتا حالانکہ روح ان کے اندر بھی پائی جاتی ہے۔ اس صورت میں مجبوراً یہ ماننا پڑے گا کہ شعور و ادراک کا تعلق روح سے نہیں ہے جو عقیدۂ مذہبی کے خلاف ہے

۳۔ اگر یہ کہا جائے کہ روح بھی دماغی نشوونما کے ساتھ ترقی کرتی ہے تو پھر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ دماغی خرابی یا موت کے ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہے، حالانکہ یہ بقاء روح کے عقیدہ کے منافی ہے

۴۔ اگر یہ کہا جائے کہ روح و حیات ایک ہی چیز ہے تو پھر حیات کے ساتھ اس کی ابتدا اور موت کے ساتھ اس کا اختتام بھی تسلیم کرنا چاہئے، اور اس صورت میں روح کو غیر فانی نہیں کہہ سکتے

۵۔ اگر روح غیر فانی ہے تو ہم کو اس کے بقاء دوام کی نوعیت متعین کرنا پڑے گی اور اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔ کیونکہ کسی چیز کے وجود کے لئے زمان و مکان کی تعیین ضروری ہے اور جب زمان و مکان کی قید لگ گئی تو پھر اسے محدود ماننا پڑے گا اور ہر محدود چیز فانی ہے۔ اس لئے روح کو بھی فانی ماننا پڑے گا

۶۔ اگر ہر انسان کی روح انفرادی طور پر علٰحدہ علٰحدہ وجود رکھتی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ وجود انسانی سے قبل بھی انفرادیت رکھتی تھی، لیکن وہ انفرادیت کیا تھی؟ اگر عقیدۂ تناسخ کی رو سے اس کا تشخص کسی اور ہستی کے تشخص کے ساتھ وابستہ تھا تو پھر اُن تمام ہستیوں کا شعور و ادراک جن جن میں وہ روح داخل ہوئی تھی یکساں ہونا چاہئے، حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ جس شعور و ادراک کی روح جسم میں داخل ہوگی، وہی شعور و ادراک انسان میں پیدا ہوگا، تو پھر اس کا جوابدہ کون ہے کہ احمد میں کیوں احتشام روح داخل کی گئی اور محمود کو کیوں عقلمند روح سے سرفراز کیا گیا

۷۔ اگر یہ کہا جائے کہ روح میں پہلے سے کوئی شعور نہیں پایا جاتا بلکہ جسم انسانی میں داخل ہونے کے بعد شعور پیدا ہوتا ہے، تو پھر یہ بتانا پڑے گا کہ اس شعور و ادراک کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے اور کیا اس کا تعلق کسی اور روح سے ہے

۸۔ اگر حیات و روح کو ایک ہی چیز تسلیم کیا جائے تو جنین کی اولین جنبش و حرکت کے ساتھ اس کے آغاز کو ماننا پڑے گا اور انسان کی موت کے ساتھ اسکے اختتام کو۔ اور اس صورت میں روح کو بھی فانی ماننا پڑے گا یا حیات کو بھی غیر فانی اور یہ دونوں مسلمات مذہب کے خلاف ہیں۔ علاوہ اس کے ہم کو ان تمام مخلوقات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا جو ذی حیات کہلاتے ہیں اور جن میں نباتات و حشرات بھی شامل ہیں۔ حالانکہ اہل مذاہب ان میں وجود روح کے قائل نہیں

(۹) اگر یہ کہا جائے کہ روح انسانی، روح حیوانی، روح نباتی اور روح حشراتی سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اس صورت میں تو ان سب روحوں کو غیر فانی ماننا پڑے گا یا پھر اس کی وجہ بتانا پڑے گی کہ روح انسانی کیوں غیر فانی ہے اور دوسری قسم کی روحیں کیوں فانی ہیں۔ اور اگر روح نباتی و روح حشراتی کے غیر فانی ہونے کو عقل قبول نہیں کرتی تو روح انسانی کے غیر فانی ہونے کو کیوں قبول کرے

(۱۰) اہل مذاہب اس کا ایک الزامی جواب یہ دیتے ہیں کہ جب مادئیین، مادہ کو غیر فانی مانتے ہیں تو روح کو غیر فانی ماننے میں کیا حرج ہے۔ یعنی اگر جسم کے اجزاء فنا نہیں ہوتے بلکہ صرف ہیئت بدلتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ روح بھی انھیں مختلف تشخصات کے ساتھ نہ پائی جائے

اہل مذاہب کا یہ اعتراض اول تو خود ان کے عقاید کے خلاف ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی روح اپنی اصلی حالت پر قایم نہیں رہی اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنے کیڑوں یا پودھوں کی روحوں میں منقسم ہو گئی اور اس طرح یوم آخرت میں انسانی روح کے جوابدہ ہونے کا عقیدہ باطل ہو جاتا ہے

(۱۱) اہل مذاہب بقاء روح اور عذاب و ثواب کے ثابت کرنے میں ایک اخلاقی منطق سے بھی کام لیتے ہیں اور وہ یہ کہ مرنے کے بعد، احیاء موتی، بقاء روح، حشر و نشر عذاب و ثواب کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک شخص اس دنیا میں باوجود عصیاں کاری کے لطف و مسرت کی زندگی بسر کرے اور دوسرا شخص باوجود تقدس و نکوکاری کے خراب و خستہ رہے۔ اس عدم توازن کے دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مرنے کے بعد ایک عدالت گاہ قایم کی جائے اور وہاں عذاب و ثواب سے دونوں پلے برابر کر دئے جائیں۔ اس صورت میں خدا کے عادل ہونے کی صفت برقرار رہتی ہے

قطع نظر اس سے کہ یہ عقیدہ علمی حقایق و مسلمات اور فطری قوانین و تقادیر کے خلاف ہے، سب سے بڑا نقص اس میں یہ ہے کہ خدا کی مسئولیت اس عقیدہ کے بعد بھی دور نہیں ہوتی کیونکہ ایک انسان کو انسان، ایک حیوان کو حیوان اور ایک پودھے کو پودھا پیدا کرنے کی ذمہ داری بہر حال خدا ہی پر عاید ہوتی ہے اور اسلئے سبزہ فریاد کر سکتا ہے کہ اسے کیوں سبزہ پیدا کر کے ہمیشہ پامال رکھا، ایک کیڑا شکایت کر سکتا ہے کہ اسے کیڑا پیدا کر کے کیوں چڑیوں اور جانوروں کا لقمہ بنایا، ایک جانور کہہ سکتا ہے کہ اسے جانور بنا کر کیوں انسان کے بس میں دیدیا اور اگر ان کا جواب یہ دیا جائے کہ یہ خدا کی مصلحت ہے "جسے چاہا بنا دیا" تو پھر انسانی دنیا کے اس عدم توازن کا بھی یہی جواب ہو سکتا ہے کہ خدا مختار ہے دنیا میں جس طرح جس کو چاہا رکھا اگر اچھے کام کرنے کو تکلیف پہونچی تو کیا اور برے کام کرنے والے آرام سے رہے تو کیا؟ خدا بے نیاز ہے اور اس سے کوئی اخلاقی باز پرس نہیں ہو سکتی

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام مذہبی عقاید صرف اس کے اس پندار کا نتیجہ ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے — اور اگر کسی کام کا نتیجہ اس کی خواہش کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ اپنی تسکین اس طرح کرنا چاہتا ہے کہ یہاں نہیں تو کہیں اور، اس وقت نہیں تو کسی وقت اور اس کی تلافی ہو گی۔ اس نے اپنی دنیاوی زندگی کے لحاظ سے اچھائی اور برائی کی تعیین کی اور اسی لحاظ سے اس نے اخروی عذاب و ثواب کی طرح ڈالی۔ بہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں عیش کی ہے، کبھی یہ نہیں چاہ سکتا کہ اس سے اس عیش کوشیوں کی باز پرس ہو اور بہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں ناکام زندگی بسر کی ہے، اپنی تسلی صرف اس طرح کر سکتا ہے کہ ایک دوسری دنیا فرض کر کے اس میں اپنے آپ کو عیش کرتا ہوا دیکھے — الغرض بقاء روح اور عذاب و ثواب کا عقیدہ خدا کی بے نیازی اور علم و عقل کو دیکھتے ہوئے ضرورت و مصلحت اور قانون قدرت دونوں کے خلاف ہے اور اس کو تسلیم کرانے کے لئے نہ کوئی ربانی دلیل پیش کی جا سکتی ہے نہ اخلاقی و علمی!

یہاں تک تو علمی بحث اس عقیدہ کے متعلق ہوئی۔ اب آیئے دیکھیں کہ اسلام نے اس گتھی کو کس طرح سلجھایا ہے۔ اور چونکہ اسلامی لٹریچر میں صرف قرآن ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس لئے ہم اپنی جستجو کو صرف آیات قرآنی ہی تک محدود رکھیں گے

قرآن مجید میں روح کا لفظ متعدد جگہ آیا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لئے ہم ان آیات کو اپنے سامنے رکھیں جن میں لفظ روح استعمال کیا گیا ہے:

قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں جن میں روح کا لفظ حضرت عیسیٰ سے تعلق رکھتا ہے مثلاً سورۂ بقر میں ارشاد ہوتا ہے "وایدناہ بروح القدس" (یعنی ہم نے روح القدس سے ان کی مدد کی)۔ سورۂ مایدہ میں خطاب ہوتا ہے کہ "ایدتک بروح القدس" (ہم نے روح القدس سے تمہاری مدد کی) سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے: "عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القیہا الیٰ مریم وروح منہ" — اس آیت میں گویا عیسیٰ کے "روح اللہ" ہونے کی صراحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ کا بھی وہی مفہوم ہے جو روح اللہ کا!

ہر چند ان آیات سے اس روح پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جو زیر بحث ہے، لیکن ان سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ روح کا لفظ اپنے لغوی و اصلی معنی سے ہٹ کر مجازاً دوسرے مفہوم میں بھی استعمال ہو سکتا ہے

سورۂ سجدہ میں ایک جگہ انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے " ونفخ فیہ من روحہ"۔ سورۂ شوریٰ میں خود قرآن کو روح سے تعبیر کیا گیا ہے: "کذلک اوحینا الیک روحا من امرنا"۔ سورۂ مومن میں ارشاد ہوتا ہے: "یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ" (یعنی اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے)

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں روح کا لفظ بمعنی الہام، وحی یا فراست استعمال کیا گیا ہے، اور اُس روح سے اس کا کوئی واسطہ نہیں جو حیات انسانی سے تعلق رکھتی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ روح کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ آیت یہ ہے:۔

"یسئلونک عن الروح، قل الروح من امر ربی" (تجھ سے روح کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں، کہدو کہ روح حکم خداوندی کا نام ہے)

اول تو اس آیت کے بعد کی آیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی روح سے قرآن یا وحی و الہام مراد ہے، کیونکہ بعد کی آیتوں میں صراحتاً وحی و قرآن کا ذکر موجود ہے۔ لیکن اگر ہم سیاق کی دوسری آیتوں سے علٰحدہ سمجھ کر یہاں روح کے معنے واقعی روح کے لیں، تو اس سے روح کی حقیقت صرف اس قدر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے اور شاید اس سے بہتر الفاظ میں روح کی حقیقت کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ جب آپ امر ربانی یا حکم خداوندی پر غور کریں گے تو وہ قانون قدرت یا مقادیر الٰہیہ کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے گا اور اس طرح روح کے معنے صرف اس حیات یا زندگی کے رہ جائیں گے، جو قانون قدرت کے مطابق پیدا ہوتی اور فنا ہو جاتی ہے

مجھے تلاش سے کلام مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ روح زندگی سے علٰحدہ کوئی دوسری چیز ہے اور موت کے بعد وہ باقی رہتی ہے

سورۂ نبا میں بیشک ایک جگہ "یوم یقوم الروح والملائکۃ صفا" کہا گیا ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً یوم قیامت کا ایک منظر اس میں ظاہر کیا گیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ پوری سورت مکہ میں نازل ہوئی تھی جب عہد رسالت کی ابتدا تھی اور کفار عرب نے رسول اللہ کو بہت پریشان کر رکھا تھا۔ یہ سورت دراصل رسول اللہ کی کامیابیوں اور کفار کی ناکامیوں کی پیشین گوئی ہے، جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب اچھی اور بُری طاقتوں کا مقابلہ ہوگا اور کامیابی رسول اللہ کو ہوگی۔

"نگار" کے خاص نمبر

جنوری ۳۷ء
ڈراما اصحاب کہف۔ خطوط آسکر وائلڈ بنام سارہ برنہارٹ اور مسئلہ خلافت و امامت پر پانچواں مقالہ ایک آزاد خیال شیعہ کے قلم سے۔ یہ خاص نمبر مختلف قسم کی دلچسپیاں رکھتا ہے ڈراما اصحاب کہف اور خطوط آسکر وائلڈ بہترین انشا پرداری کا نمونہ ہیں صفحات ۱۴۴ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۳۹ء
(مصحفی نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:
حیات مصحفی۔ اُردو غزل گوئی میں مصحفی کا مرتبہ۔ مصحفی کی غیر مطبوعہ مثنویاں۔ انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔
صفحات ۱۹۴
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۰ء
(نظیر نمبر) اس کے بعض عنوانات یہ ہیں:۔
نظیر کا مسلک شاعری پر تبصرہ
نظیر اور عوام
انتخاب کلام مطبوعہ و غیر مطبوعہ۔
صفحات ۶۸
قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

جنوری ۴۱ء
یہ نمبر دنیائے تذکرہ میں بالکل پہلی چیز ہے یعنی اسوقت کے تمام مشہور غزل گو شعراء نے خود اپنے حالات لکھے ہیں اور خود اپنے کلام کا انتخاب کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ایک مقالہ غزل گوئی پر بھی ہے جو دیکھنے کے قابل ہے۔
قیمت دو روپیہ آٹھ آنہ علاوہ محصول

جنوری ۴۲ء
اس نمبر میں ملک کے پانچ مشہور نقادوں نے اُن شاعروں کے کلام پر تبصرہ کیا ہے جن کی غزلوں کا انتخاب جنوری ۴۱ء میں شایع ہوا تھا یہ نمبر گویا تتمہ ہے جنوری ۴۱ء کا اور اُسکے ساتھ ہی اسکا مطالعہ بھی ضروری ہے ان دونوں نمبروں سے ملکر ایک ایسا تذکرہ مرتب ہو جاتا ہے جو اسوقت تک پیش نہیں کیا جا سکا قیمت ۸ر علاوہ محصول

کلیاں

(ایک نفسیاتی مطالعہ)

ہندوستان کا درخشاں مستقبل ہماری آنے والی نسل سے وابستہ ہے ـــــ یہ گویا اس سرزمین ہمالہ کا ایک ہمالائی مفروضہ ہے۔

اس کالی کلوٹی، دُبلی پتلی، بیمار اور مضمحل اور مریل آنے والی نسل کو مستقبل کی درخشندگی سے کیا واسطہ۔ مستقبل کی درخشندگی کے لئے تو تنومند ہاتھ پاؤں تندرست جسم، صحت مند دماغ اور ہمیشہ خوش رہنے والا جی چاہئے۔ مگر یہاں تو دبلے پتلے ہاتھ پاؤں، پوست واستخواں جسم، چھوٹی چھوٹی کھوپڑیاں اور ہمیشہ اُداس رہنے والے دلوں کے سوا کچھ بھی نہیں۔ پھر درخشندہ مستقبل کا کیا مفہوم ہے ـــــ؟

یہ رمضانی، خیراتی کا بیٹا ہے۔ خیراتی بارہ روپیہ ماہوار کمانے والا ایک چپراسی ہے اس کے دس بارہ لڑکے ہیں اور گھر میں ایک روتی صورت بیوی گیارھویں بچے کے لئے تکلیف اُٹھا رہی ہے۔ اس کے یار دوست سمجھتے ہیں کہ خیراتی بڑا بھاگوان ہے۔ مگر تیس برس کی عمر میں ہی بھاگوان کی داڑھی سفید ہو رہی ہے۔ کمر بھی کمان بنتی جا رہی ہے گویا وہ زمین پر اپنی قبر کے لئے جگہ ڈھونڈ رہا ہے۔ دو ایک سال میں خیراتی رینگتا رینگتا اس دنیا سے دور بارہ انسانوں کو شہر کی گلیوں میں بھیک مانگنے اور ٹھوکریں کھانے کے لئے چھوڑ جائے گا۔ پھر وہ لوگ جنھیں ہندوستان کا درخشندہ مستقبل ان گیارہ روٹی روٹی کو ترسنے والے بچوں کے ساتھ وابستہ نظر آتا ہے، چیخیں گے کہ ہماری بے روزگاری دور کرو۔ مالدار ملک کے بچے سڑکوں پر بھیک مانگ رہے ہیں۔ مگر گورنمنٹ کیا کر سکتی ہے۔ اس کا علاج تو قدرت کے پاس بھی نہیں۔

اب یہ گیارہ رمضانی، سڑکوں سے محلوں۔ محلوں سے بدمعاشوں کے اڈوں اور پھر جیل خانوں تک پہونچ جائیں گے۔ جیل خانوں کی اندھیری کوٹھریوں میں ایسا مہیب اندھیرا ہوتا ہے کہ مستقبل کا درخشاں چہرہ یہاں نظر ہی نہیں آسکتا۔

طرہ بازخاں، شیر افگن خاں کا بیٹا ہے۔ اس کی سات پشتوں سے سپہ گری چلی آرہی تھی مگر لارڈ میکالے کے مینانے کی بادہ کشی کے بعد شیر خاں نے اہلکاری کو سپہ گری پر ترجیح دی۔ اب اس کا بیٹا ایک نرم ونازک لڑکا ہے، چار سال سے انٹرنس میں فیل ہو رہا ہے۔ کالج کے بجائے چائے خانوں میں گپیں ہانکتا ہے۔ سگریٹیں پیتا ہے۔ ایکٹرسوں کے دستخطی خطوط پر ماہانہ دس روپیہ خرچ کر دیتا ہے۔ پتلی سی کمر۔ دھنسا ہوا سینہ۔ کمزور آواز۔ آنکھوں پر عینک۔ گال پچکے ہوئے اور نام طرہ بازخاں! ـــ کیا انہی دبلے پتلے دلاوروں کے ہاتھوں میں آزادی اور جگمگاتے مستقبل کے پھریرے لہرائیں گے؟

نواب فلاں بہادر ولد فلاں بہادر۔ عمر صرف سترہ سال مگر ماہانہ دو سو روپیہ جیب خرچ ملتا ہے۔ ایک رولس رائیس کار ہے اور آبِ گلنار کا شوق۔ ایک اینگلو انڈین حسینہ پر روپیہ پانی کی طرح بہاتا ہے۔ چھ چھ نوجوان خواصیں پاؤں دابنے کے لئے نوکر ہیں۔ تعلیم و تربیت ٹیلیفون سے ہوتی ہے۔

بیچارے ہندوستان کی آیندہ نسل کے مستقبل کا یہ نوجوان ضامن۔ اور اس کی یہ آن بان۔ یہ کمزور جوانی۔ مگر وہ ہندوستان کو کب خاطر میں لاتا ہے۔ جیب خرچ۔ رولس رایس کار۔ افشردۂ انگور۔ اینگلو انڈین حسینہ اور ٹیلیفون ـــ اُس کے لئے اس سے زیادہ خوبصورت اور اس سے بڑھ کر سندر ہندوستان اور کیا ہو سکتا ہے۔

رمضانی۔ طرہ بازخاں۔ اور نواب زادے۔ چمن ہند کی کھلنے والی کلیاں ہیں۔ چٹکنے والے غنچے ہیں۔ بادِ نسیم کے منتظر ہیں۔ مگر میرے دل میں وسوسہ پیدا ہوتا ہے۔ کوئی کان میں جیسے چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے۔ خبردار ہو، نسیم کہاں ـ بادِ سموم آنے کو ہے۔ ان شہری بچوں کو چھوڑو۔ یہ ہاتھ سے گئے۔ فرعون نے اگر کالج قایم کر دیا ہوتا تو حضرت موسیٰ کی آمد کا خطرہ پیدا ہی نہ ہوتا مگر لارڈ میکالے کو یہ ترکیب سوجھ گئی۔

ملک میں نئی نئی تحریکیں شروع ہو رہی ہیں دیہات سدھار اور گاؤں سدھار، کھادی پرچار، دل کے کسی تاریک گوشہ میں امید کا کوئی دیا ٹمٹماتا ہے دل کہتا ہے

کو صبر کرو اچھا زمانہ آئے گا۔ مگر جب رمضانی اور دلاور خاں اور رولس رائس والے نوجوان کو دیکھتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا موت نے زندگی کا ایک خوبصورت نقاب چہرہ پر ڈال لیا ہے۔ آج سے دس سال پہلے اسی دیہات سدھار تحریک کے سلسلے میں مجھے ایک گاؤں جانا ہوا تھا۔ وہاں کے پرائمری اسکول کا معائنہ کیا تیسری جماعت میں منجملہ چالیس کے گیارہ طلبہ حاضر تھے۔ ہری چند کی ریاضی کی قابلیت دیکھ کر میں نے اندازہ لگایا کہ یہ بڑا ماہر ریاضی داں ہوگا۔ اختر علی نے پھولوں پھلوں پودوں اور ٹینڈک اور چھوٹے چھوٹے کیڑوں کے متعلق مجھ سے بہت سی باتیں پوچھی تھیں۔ میں نے پیش قیاسی کی تھی کہ یہ کوئی بڑا ڈاکٹر ہوگا یا مشہور سائنس داں۔ گنیش پرشاد کی تاریخی قابلیت دیکھ کر مجھے "پروفیسر حبیب" یاد آگئے۔

مگر کیا میرے قیاس صحیح نکلے ——————— ؟

اس کے صرف چھ سال بعد میں دوسری مرتبہ اس گاؤں کے معائنے کو گیا۔ گاؤں میں داخل ہوتے ہی میں نے دیکھا کہ ریاضی داں ہری چند اناج کی دوکان پر بیٹھا آٹا تول رہا ہے۔ اختر علی نواب صاحب کے آم کے باغ کی رکھوالی کر رہا ہے۔ اور میرا "پروفیسر حبیب" گاؤں کے مدرسے میں پانی میں بھیگی ہوئی بید کی چھڑی لئے طالب علموں کا انتظار کر رہا ہے ۔ میں نے گنیش پرشاد سے پوچھا:

"تم نے کہاں تک تعلیم حاصل کی ؟" ——————— "پرائمری تک"

"اور مدرس کیسے ہو گئے ؟" ——————— "میرے باپ نواب صاحب کے گھر نوکر تھے انھوں نے سفارش کر دی"

سفارش ۔ ہونہہ ۔ یہ لفظ، لفظ نہیں فولاد کا ہتوڑا ہے۔ کتنے ہی دل اس ہتوڑے سے کچلے جاتے ہیں۔ اس کا تلفظ بھی غلط ہے اور املا بھی غلط۔ سفارش کے بجائے سازش ہونا چاہئے۔ یہی صحیح ہے —— میں نے اس سے پھر پوچھا:

"آپ ان لڑکوں کو پڑھا بھی لیتے ہیں ؟" ——————— "جی ہاں —— جی ہاں ۔ خوب"۔

"اچھا تو بتائیے آج کل کانگرس کا صدر کون ہے" ——————— "گاندھی جی"۔

"ارے تم کس زمانے کی بات کر رہے ہو۔ میں آجکل کی بات پوچھتا ہوں" —— "کیا جانے کون ہے جناب ۔ یہاں کوئی اخبار تو آتا نہیں ہے"

عذر معقول ہے ۔ معلوم نہیں دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ بیچارے دس روپے کمانے والے ماسٹر صاحب اخبار پڑھیں یا نئی پود کی جڑوں میں پانی ڈالیں میں نے اس کی پیٹھ تھپکی۔ حیرت ہے میں نے اس کا گلہ نہ دبا دیا۔

"اچھا آج کتنے لڑکے حاضر ہیں" ——————— "چالیس میں سے گیارہ"۔

میں چیخ پڑا ۔ "یہ کیا۔ ہمیشہ چالیس میں گیارہ حاضر اور انتیس غایب ؟" —— اس نے بید ہلاتے ہوئے جواب دیا:

"گاؤں کے لڑکے پڑھنے کے شوقین نہیں ہوتے جناب"

میں نے دل ہی دل میں کہا ۔ کیا بکتا ہے ۔ پہلے اپنے ہاتھ سے یہ بید کی چھڑی اٹھا کر دور پھینک ۔ تو مدرس ہے، قصائی نہیں ہے۔ اسی چھڑی کے ڈر سے باقی انتیس لڑکے مسمار قلعوں میں۔ پرانے برجوں میں، ٹوٹے ہوئے میناروں میں، باغوں اور کھنڈروں میں چھپتے پھرتے ہیں اور کیا جانے یہ نوعمری۔ یہ تنہائی، یہ ویرانی اور آزادی ان کے دل میں کیسے کیسے خطرناک ارادے اور کیسی کیسی ناپاک خواہشیں پیدا کرتی ہوں گی۔ ورنہ پھر یہ دبلے دبلے ہاتھ پاؤں۔ چھوٹی چھوٹی کھوپڑیاں۔ بیمار آنکھیں اور مریل صورتیں ذرا تو تر و تازہ نظر آتیں۔

ہری چند کے باپ سے میں نے پوچھا:۔ آپ نے اپنے لڑکے کو آگے تعلیم کیوں نہیں دی۔ وہ لڑکا تو بڑا ذہین تھا اور آپ تو انگلیوں میں سونے کی انگوٹھیاں بھی پہنتے ہیں"

"جناب ۔ ہمیں پڑھا لکھا کر کرنا کیا ہے۔ پرائمری تک ہی کافی ہے۔ لڑکا حساب کتاب کے قابل ہو جاتا ہے"

میں نے اس کو کچھ سمجھانا چاہا مگر وہ اپنے کھاتوں کا حساب جوڑنے میں مشغول ہو گیا۔

"اختر علی سے میں نے دریافت کیا تم کیوں آگے نہ بڑھ سکے ؟"

"جناب، میرا باپ کہتا ہے کہ شہر جا کر لڑکے آوارہ ہو جاتے ہیں۔ ہمارے یہاں کے ٹھیکہ دار فتح خاں کا لڑکا محمد نوح شہر میں دسویں جماعت میں تعلیم پاتا ہے

سوٹ بوٹ میں پھرتا ہے۔ گھر کے کام کاج سے جی چراتا ہے۔ اور ـــــ اور ایک راز کی بات کہوں جناب۔ اس کے وہاں کئی کئی لڑکیوں سے تعلقات بھی ہیں۔ یہی سوچ کر میرے باپ نے پرائمری کے آگے میرا پڑھنا روک دیا۔"

یہ جواب سُنکر میں لاجواب ہوگیا ـــــ یہ مسکراتی ہوئی کلیاں اور پرائمری کی بادِ سموم ۔۔۔۔۔۔۔ مایوس اور بے مراد ہوکر میں شہر لوٹا۔ اور گھر پہونچتے ہی ایک عجیب واقعہ معلوم ہوا۔ خیراتی چپراسی کی لڑکی میرے ڈرائیور کے ساتھ کہیں بھاگ گئی۔ کیونکہ اس نے کہیں سے ایک جاپانی ریشم کا جمپر اسے لا دیا تھا۔ اور وہ خود اچھے اچھے کپڑے پہنتا تھا۔ اس کے سر پر چمکدار بال تھے۔ وہ لڑکی جھوٹے نگوں کی چمک پر ریجھ گئی اور اس کے ساتھ بھاگ گئی۔

ایک ہی سال بعد ڈرائیور واپس لوٹا مگر تنہا۔ اُس سے اس لڑکی کی بابت پوچھا گیا کہ وہ کہاں ہے تو وہ خود نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہے۔

اس ماحول کی بدنصیب لڑکیاں۔ یہ انگریزی بال۔ اچھے اچھے کپڑے۔ جاپانی ریشم پر مرنے والی لڑکیاں۔ وہ کس آسانی سے اپنی خواہشوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں اور پھر کوئی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں۔ حالانکہ وہ تو منظرِ عام پر۔ پُر رونق بازاروں میں سُرخ سُرخ ساڑیاں پہنے، آڑی ترچھی مانگیں نکالے لال لال پاؤڈر گالوں پر تھوپے تھیٹر اور سینما میں تھرک تھرک کر طبلہ کی تھاپ پر ناچ رہی ہیں ـــــ اس کا باپ صرف بارہ روپے کماتا تھا، مگر بیٹی بارہ سو روپے کماتی ہے۔ اس لئے کہ اُس نے عزت کے بدلے زندگی مانگی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ زندگی کے بدلے عزت کا سودا بڑا بھاری سودا ہے۔

شیر افگن خاں کلرک کی ایک لڑکی ہے۔ عمر چھبیس سال مگر اب تک کنواری ہے۔ اور نہیں معلوم کب تک کنواری رہے گی۔ کیونکہ شیر افگن خاں کی آمدنی چالیس روپیہ اور خرچ پچاس روپے ہے ـــــ اور اس دیس میں تو شادی بڑا مہنگا سودا ہے۔ گیارہ گیارہ ہزار روپے جہیز۔ ایک موٹر۔ ایک ریڈیو سٹ۔ مزید برآں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے چوگنی ہے۔ یہ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ "جذبات" کے صحیح مفہوم سے آشنا ہے۔ اس کا وجود معنوی ہر گزرنے والے نوجوان کو آواز دیتا ہے کہ "مجھے اس قید سے نکال لو۔ کسی طرح مجھے اپنی بیوی بنالو ـــ میں موٹر نہیں دے سکتی۔ میں سونے کی پازیب نہیں دے سکتی"۔

اب کون انکار کرسکتا ہے کہ ہندوستان کا مستقبل درخشاں نہیں ہے ـــــ؟ ابھی ابھی میں کہہ رہا تھا کہ مستقبل کی درخشندگی کے لئے تنومند ہاتھ پاؤں تندرست جسم۔ صحت مند دماغ اور ہمیشہ خوش رہنے والا جی چاہئے۔ مگر یہاں دبے دبلے دلاور خاں اور مریل سرفروش خاں بستے ہیں۔

کیا انہی دلاوروں اور سرفروشوں سے ہندوستان کا درخشندہ مستقبل وابستہ ہے؟

کیا یہی نوح، سیلاب میں کشتیاں تیرائیں گے؟

کیا یہی کلیاں آنے والے بہار کا نغمہ گائیں گی؟

کیا انہی کے ہاتھوں آزادی کے پھریرے بلند ہوں گے؟

ابراہیم جلیس (بی۔اے)

نگار کے پچھلے پرچے

(۲۶ء) جنوری عہ ر۔ (۲۷ء) اگست عہ ر۔ (۳۰ء) مئی عہ ر۔ (۳۱ء) جولائی ۸ ر۔ اگست ۸ ر۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر ۸ ر۔ نومبر ۸ ر۔ دسمبر ۸ ر۔ (۳۲ء) فروری عہ ر۔ مارچ عہ ر۔ مئی، جون، جولائی، ستمبر ۸ رنگی پرچہ۔ نومبر عہ ر۔ (۳۳ء) فروری عہ ر۔ (۳۴ء) فروری، مارچ، مئی، جون، ستمبر، اکتوبر، نومبر، دسمبر عہ رنگی پرچہ ـــ (۳۶ء) دسمبر عہ ر۔ (۳۷ء) جنوری عہ ر۔ فروری عہ ر۔ مارچ، اپریل، مئی، جون، جولائی، اگست ۸ رنگی پرچہ۔ اکتوبر عہ ر ـــ (۳۸ء) جنوری عہ ر۔ فروری ۸ ر۔ اپریل عہ ر۔ مئی تا دسمبر ۸ رنگی پرچہ ـــ (۳۹ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جولائی ۸ رنگی پرچہ۔ ستمبر عہ ر۔ اکتوبر، نومبر ۸ رنگی پرچہ۔ (۴۰ء) جنوری عہ ر۔ فروری تا جون ۸ رنگی پرچہ، جولائی، اگست عہ رنگی پرچہ، ستمبر تا دسمبر ۸ رنگی پرچہ۔ (۴۱ء) جنوری۔ فروری عہ ر۔ مارچ تا دسمبر ۸ رنگی پرچہ ـــ (۴۲ء) جنوری، فروری عہ ر۔ اپریل، مئی، جون، جولائی ۸ رنگی پرچہ۔

مینجر نگار لکھنؤ

ریاض اور ہم

افسوس ہے کہ پروفیسر آل احمد سرور کا یہ مقالہ ہمیں بعد از وقت ملا تھا، اس لئے ریاض نمبر میں شامل نہ ہو سکا تھا ——— نیاز

دو تین دن ہوئے ریڈیو پر ایک مشاعرہ سن رہا تھا۔ اس دور کے کئی ممتاز شاعروں نے اپنا کلام سنایا۔ ان میں وہ بھی تھے جو ابھی بہت زیادہ مشہور نہیں اور وہ بھی جو اچھی خاصی شہرت رکھتے ہیں۔ اتفاق سے بیشتر نئے رجحانات سے ہمدردی رکھتے تھے۔ ان کے کلام میں اس دور کے موضوعات بھی تھے اور تجربات بھی، مستی بھی اور رنگینی بھی مگر اس مستی میں کچھ تلخی اور اس رنگینی میں کچھ "تازہ و درخشاں لہو" بھی شامل تھا۔ یہ فطرت اور انسان دونوں کے حسن سے متاثر تھے مگر کوئی خلش انھیں بے چین کئے ہوئے تھی۔ یہ کھل کر ہنس نہ سکتے تھے، جی بھر کر پی نہ سکتے تھے، بلند آواز سے قہقہہ نہ لگا سکتے تھے۔ یہ چمن زاروں، کوہساروں، صبح و شام، چاندنی اور شراب کے حسن کے قایل تھے، مگر ہر شے میں کسی شے کی کمی پاتے تھے۔ نغمے کی نرمی، شیرینی اور ملاطفت سے انھیں تسکین نہ ہوتی تھی، وہ اس میں شمشیر کی تیزی اور بجلی کی چمک ڈھونڈھتے تھے۔ انکا ذہن مریض نہ تھا، حساس زیادہ تھا، احساس کی یہ غیر معمولی شدت، ان کی دولت بھی تھی اور اس نے ایک دولت سے انھیں محروم بھی کر رکھا تھا۔ ان کا ذہن انھیں کسی اور دنیا میں لئے جا رہا تھا مگر ان کے گرد و پیش کی زندگی اب بھی ماضی کے دامن سے لپٹی ہوئی تھی۔ یہ قدیم روایات، اسالیب اور الفاظ سے بیزار تھے، مگر ان کے اپنے اسالیب اور الفاظ ان کے جذبات کی مکمل ترجمانی سے قاصر نظر آتے تھے۔ ایک جنگ کی صعوبتیں جھیلے ہوئے اور دوسری جنگ سے دوچار، یہ بیچارے شاعر اور ادیب، اپنے دل میں ساری دنیا کا درد لئے، غم روزگار کے مارے، غم عشق کے ستائے، ریڈیو پر شعر سنا رہے تھے، میں غور سے سن رہا تھا۔ کیونکہ اپنی ساری لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود، ان کے اشعار میں اس دور کی روح بول رہی تھی۔ ان کا احساس اور تجربہ، اس دور کا احساس اور تجربہ معلوم ہوتا تھا۔

اور اس احساس اور تجربے کے بعد اگر کوئی ریاض کی دنیا میں داخل ہو تو اسے کیا نظر آئے؟۔ اگر کسی کا احساس سطحی، اور تجربہ مستعار ہو اگر وہ محدود اور مخصوص ہو تو ممکن ہے اسے کچھ نہ نظر آئے۔ ریاض کے پاس ان لوگوں کے لئے کچھ نہیں ہے جو ادب کو محض قدیم یا جدید کے نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں جو محض انقلاب کو شاعری اور شاعری کو ہر قید و بند سے آزاد سمجھتے ہیں، جو شاعری کو مارکس کی خادمہ یا غزل کو "نیم وحشیانہ صنف شاعری" قرار دیتے ہیں۔ ریاض کی دنیا کا حسن انھیں پر ظاہر ہوتا ہے جو زندہ دلی، شگفتگی، شوخی، رندانہ بانکپن، کا نام سنکر منہ نہیں بگاڑتے، جو ساری عمر رونی اور سنجیدہ صورت نہیں بنائے رہتے، بلکہ جو ہنستے بولتے، چھیڑنے، کھیلنے کے اب بھی قایل ہیں۔ ریاض خود بڑے بے تکلف آدمی ہیں، لیکن ان کی صحبت کا پورا پورا لطف اٹھانے کے لئے تھوڑا سا ریاض کرنا پڑتا ہے، کچھ دور ان کے ساتھ جانا پڑتا ہے۔ ان کا راستہ بذات خود زندگی کی منزل نہیں ہے، ایک دلچسپ، دلکش اور دلاویز گوشہ ہے۔ اسی دلچسپی، دلکشی اور دلآویزی کی طرف مجھے اشارہ کرنا ہے۔

ریاض خوش نصیب تھے۔ ان کی زندگی میں اتنی الجھنیں نہ تھیں جتنی آج ہیں۔ انھوں نے آنکھ کھولی تو سرسید اور حالی سے اپنے آپ کو دور اور داغ، امیر اور جلال سے قریب پایا۔ وہ امیر کے شاگرد تھے ؎

مست مینا ہوں، پیا ہے میں نے جام امیر احمد مینائی کا

مگر داغ اور جلال کے بھی مانے والے تھے۔ انھوں نے اپنے اشعار میں میر اور مصحفی کے فیضان کا بھی اعتراف کیا ہے۔ انھیں اپنے تغزل پر فخر تھا، داغ کے رنگ پر چلنے والا، رامپور اور لکھنؤ کی ادبی صحبتوں میں آنکھوں کا تارا بنا رہا۔ اسے چھیڑنے کے لئے حسین، پڑھنے کے لئے اشعار اور قدردانی کے لئے سرپرست میسر تھے۔ کیا تعجب جو اس کی نگاہ اس مے و مینا سے آگے نہ گئی۔ اس نے شراب پی ہو یا نہ پی ہو، عشق ضرور کیا تھا، اتنا جاندار، شوخ، چنچل، چلبلا، مجنونانہ، بانکا، بے تکلف عشق کہ اس کے اشعار اس عشق کے اثر سے ابتک رقصاں نظر آتے ہیں۔ اس کے ساغر میں کوثر کی بھی ہے اور ممکن ہے (میکدے والی بھی ہو؟) لیکن دراصل

اُس میں جوانی کی شراب ہے۔ ریاض نے واقعی پی تھی یا نہیں یہ مسئلہ صرف اس وجہ سے اہم ہے کہ ریاض کے کلام میں جتنے شعر خمریات کے ہیں شاید کسی اور کے یہاں نہیں اور صرف اشعار کی تعداد ہی زیادہ نہیں، یہ مضمون بھی اُنھوں نے اپنا لیا ہے، ریاض کے متعلق کئی معتبر گواہ یہ کہتے ہیں کہ اُنھوں نے کبھی نہیں پی مگر حامد حسن صاحب قادری نے اپنے ایک مضمون میں ایک "جہاندیدہ شاعر" کا حوالہ دیا ہے جنھوں نے اُنھیں پیتے دیکھا تھا۔ اس سلسلہ میں خود ریاض کا بیان یہ ہے ؎

شعر تر میرے چھلکتے ہوئے ساغر ہیں ریاض،
پھر بھی سب پوچھتے ہیں آپ نے پی ہے کہ نہیں

کچھ کام نہیں مے سے، گو عشق ہے اس شے سے
ہیں رند ریاض ایسے، دامن بھی نہ تر دیکھا

ہے ریاض اک جوان مست خرام
نہ پیئے اور جھومتا جائے

ریاض کی شراب ایک تو یہ ہے ؎

مے نور خدا ہوتی، دل عرشِ خدا ہوتا،
تھوڑی سی جو پی لیتے، کیا جانیے کیا ہوتا

نشہ ریاض ساقیِ کوثر سے مل گیا
گھر بیٹھے اب تو بادۂ کوثر بنائیں گے،

یہ مے اُترتی سینے میں ہے صاف بن کے نور
وہ اور شے ہے پیتے ہیں سب جس کو چھان کے

یہ جتنے پینے والے ہیں ریاض ان سب کے مرشد ہیں
ہمیشہ جام مے میں نور حق کا دیکھنے والے

اُڑتی تھی وہ شے آتی تھیں جنت سے ہوائیں
اب رندوں کا جمگھٹا ہے نرغہ نہیں ہوتا

دُنیا سے الگ ہم نے، میخانے کا در دیکھا
میخانے کا در دیکھا، اللہ کا گھر دیکھا

اس شراب کا ذکر اُنھوں نے بڑے مزے لے لیکر کیا ہے۔ جام و آبشت میں یہی شراب ہے۔ جو ریاض کو مست کئے ہوئے ہے۔ مگر ریاض کی مستی صرف بادۂ تصوف کی نہیں ہے، اس میں چیزے دگر بھی ملی ہوئی ہے، یہ جوانی کی شراب ہے، حسن کی شراب ہے اور پھر کالی کالی بوتلوں میں سرخ سرخ شراب، ہے۔ اس کے لئے انھوں نے بڑے پیارے نام وضع کئے ہیں۔ اسے کہیں میکدے والی، کہیں پری، کہیں پھول کے نام سے پکارتے ہیں۔ غرض ان کے یہاں یہ سب شرابیں ایسی مل جُل گئی ہیں کہ حافظ کی شراب کی طرح، صوفیوں، رندوں اور شاعروں کو یکساں مست کرتی ہیں۔ اُن کے بادہ و ساغر کے پردے میں مشاہدۂ حق بھی ہے، مشاہدۂ حُسن بھی اور ایک مخصوص نظر سے مطالعۂ حیات بھی۔

حُسن و عشق، رندی و سرمستی کی یہ دُنیا بڑی رنگین اور دلفریب معلوم ہوتی ہے، اس سے نکلنے کو کس کا جی چاہتا ہے، مگر اس میں مست رہنا ارشاب کے قائم رہنے اور غم روزگار سے آزاد رہنے پر منحصر ہے۔ ریاض نے اپنے لئے دنیا میں ایک جنت بنالی تھی، انھوں نے آخر تک اسی میں عمر گزارنی چاہی مگر وقت نے انکا ساتھ نہ دیا ؎

جو ساتھ دے تو یہ دُنیا سوا ہے جنت سے
مزے کی چیز الٰہی سٹ باب ہوتا ہے

نشۂ مے سے جواں بنتے ہیں، پیری میں ریاض
وقت ہے توبہ کریں، اب قبر کا ساماں کریں

اُن پر بھی بعض بلاؤں کا سایہ پڑ ہی گیا۔ پہلے ان کی للچائی ہوئی نگاہیں حسن پر ہر عمر اور ہر عالم میں پڑتی تھیں، مگر پھر سارا دایل آیا اور گاندھی جی آئے اور میکشی کے بند کرنے کا حکم ہوا، جنگ کی وجہ سے گرانی کا یہ اثر ہوا کہ شراب اُدھار بھی نہ ملی، بے حجابی عام ہوئی، نئی تہذیب نے اپنے قدم جمائے۔ بیچارے ریاض جو عصا لئے عبا پہنے، عمامہ باندھے، میکدے جایا کرتے تھے۔ اب راستے میں یہ سب باتیں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں، بھڑکتے ہیں اور جھنجھلاتے ہیں، مگر آخر وقت تک اس وضع کو نبھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وضع داری میں بھی ایک لطف ہے۔

ریاض نے جا بجا اپنے اشعار میں اپنے کلام کی بعض خصوصیات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ ان کے یہاں میر، مصحفی، داغ، جلال، امیر کا اعتراف ملتا ہے۔ وہ اپنے یہاں زبان کی صحت، زبان کا لطف، تغزل، شوخی، رندی، جوانی کی داستان، قدرت بیان کی طرف بار بار توجہ دلاتے ہیں۔ انھیں کی زبانی سنئے ؎

یہ خاص رنگ ہمیشہ سے تیرا حصہ ہے
ریاض جانتے ہیں سب تجھے تغزل میں

کچھ کچھ ہے ریاض میر کا رنگ،
کچھ شان ہے ہم میں مصحفی کی،

کہتے ہیں خسرو تمھیں ساحر ریاض
تم کہیں خسرو، کہیں تم میر ہو

یادگار اس وقت ہم بھی ہیں زمانے میں ریاض
مانتے ہیں سب ہمیں، ہم مانتے ہیں میر کو

واہ کیا رنگ ہے کیا خوب طبیعت ہے ریاض
ہو زمیں کوئی تمھیں پھوتے پھلتے دیکھا

ہم نے بھی ریاض آپ کے اشعار سُنے ہیں
یہ لطف بیاں، لطف زباں ہو نہیں سکتا

وہی شباب کی باتیں وہی شباب کا رنگ
تجھے ریاض بڑھاپے میں بھی جواں دیکھا

میرے بیان پر آج ہے طرز بیاں کو ناز
میری زباں پر آج ہے ہندوستاں کو ناز

ریاض اشعار سُن سُنکر فرشتے وجد کرتے ہیں
ملی کوثر سے دھوئی، ایسی پاکیزہ زباں مجھ کو

حصے میں آئی ہے جناب ریاض کے
پاکیزگی زباں کی ادائے بیاں کے ساتھ

منظور تھی شستگی زباں کی
تھوڑی سی شراب ناب پی لی

میں نے ریاض کے اتنے اشعار اسوجہ سے یہاں دئے ہیں کہ بعض وقت لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ خود شاعر کیا کہتا ہے، وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ ان کے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق اشعار کہاں تک مل سکتے ہیں۔ ایک غزل گو شاعر کے اشعار سے سطحی نظر رکھنے والے ہر قسم کے اشعار تلاش کرکے اُس پر تنقید کی ایک عمارت کھڑی کرسکتے ہیں غزل گو شاعر کے یہاں ہر رنگ پائی جاتی ہے۔ اس لئے اس کی مخصوص آواز کو پہچاننا ضروری ہے۔ اس پہچان میں خود شاعر بڑی مدد کرتا ہے۔ وہ پکار پکار کر اپنی خصوصیات کی طرف توجہ دلاتا ہے۔ ریاض نے بھی یہی کیا ہے مگر مولوی سبحان اللہ مرحوم اور مہاراجہ محمود آباد مرحوم ان خصوصیات کا لحاظ رکھنے کے بجائے ان کے اشعار کو اپنے مذاق کے مطابق کرنا چاہتے تھے۔ وہ جو اصلاحیں ریاض کے کلام پر دیتے تھے وہ شعر کی شریعت میں گناہ تھیں، مگر انھیں اس کا خیال نہ تھا۔ اسلئے ضرورت ہے کہ پہلے ریاض کے مذاق خاص کی ترجمانی کی جائے۔ اس کے بعد اپنے مذاق کے مطابق اُسے پرکھا جا سکتا ہے۔

ریاض جیسا کہ اُنھوں نے خود کیا ہے تغزل کے شیدائی ہیں۔ ولی و میر کی یہ روایت اُردو غزل کی زندہ روایات میں سے ہے۔ حُسن و شباب کی مصوری اور اقبال کے الفاظ میں کتاب دل کی تفسیر اور خواب جوانی کی تعبیر، غزل کا محبوب عنوان ہے۔ جب غزل میں اور بھی رنگ آئے تو اُس نے تغزل کے نام سے اپنی اس خصوصیت کو ظاہر کیا۔ موضوع کے لحاظ سے اس کا ایک خاص اُسلوب ہوا۔ لطیف خیالات کے لئے لطیف زبان کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے تغزل صرف حُسن و عشق کی مصوری تک محدود نہ رہا بلکہ ایک رنگین و شگفتہ اسلوب بن گیا اور اس طرح اس نے وہاں بھی جلوہ دکھایا جہاں غزل کے بجائے نظم کی حکومت تھی۔ چنانچہ حالی کے تغزل، انیس کے تغزل اور اقبال کے تغزل کا کون معترف نہیں (محض غزلوں میں نہیں نظموں میں) اس تغزل نے اُردو شاعری کو ایک خاص چاشنی دی۔ اسکی علامات فارسی سے آئیں مگر ان میں اتنی لچک اور جامعیت موجود تھی کہ متصوفانہ خیالات، سیاسی انقلاب، اخلاقی تعلیم فلسفیانہ موضوعات سب کی ترجمانی کرسکیں۔ ان علامات میں بادہ و ساغر، محبوب، رقیب، شیخ، قفس، آشیاں سب سے بڑے بڑے کام لئے گئے۔ کچھ سطحی نظر رکھنے والے یہ سمجھے کہ اُردو شاعری میں صرف چڑیا ری سکھائی جاتی ہے یا بادہ فقصاب کی دوکان کا منظر پیش کرتی ہے حالانکہ آشیاں اور قفس ہندوستان میں ہمیشہ بہت محبوب علامات رہی ہیں اور اس قتل عام میں قاتل کا پہچاننا چنداں مشکل نہیں ہے۔ میر نے غزل کو جو روایات دیں اُن میں یہ جامعیت موجود تھی، ہمارے اچھے شعرا نے ان سے بڑے بڑے کام لئے، مگر لکھنؤ اسکول میں یہ روایات رسمی طور پر زیادہ آئیں، ایک زندہ میراث کی حیثیت سے کم آئیں۔ حالی نے در اصل اسی رسمی غزل کے خلاف بغاوت کی تھی ورنہ وہ قدما کی غزلوں کے بڑے مداح تھے۔

ایک اور خرابی یہ ہوئی کہ بعض لوگوں نے محض چند مخصوص علامات ہی کو شاعری سمجھا، نتیجہ یہ ہوا کہ اُنھیں کی ایک خاص ترکیب سے شعر کہ لینا بہت آسان ہوگیا اور اُس میں انفرادی اور ذاتی تجربہ کی روح نہ رہی۔ حالی کو غزل کی سادگی اس وجہ سے اور عزیز تھی کہ وہ اصلی خیال کو اس قدر "پردہ نشین" بنا کر رکھنا مضر سمجھتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ علامات میں اتنی تہیں نہ ہوں کہ حقیقی اور مجازی معنی تلاش کرنے میں عوام کی عمریں صرف ہوجائیں، وہ اسیقدر مخصوص مبہم، کنایاتی، در پردہ شاعری کے خطروں سے واقف ہوگئے تھے۔ اس دور میں جس کھڑی اُردو کا شاعروں نے استعمال شروع کیا ہے وہ اسی کے رد عمل کے طور پر ہے اور میں اسے ایک اچھا رجحان سمجھتا ہوں۔

اوپر جو کچھ کہا گیا ہے اُس سے تغزل اور اُس کی مخصوص زبان کی خوبی اور خامی دونوں واضح ہوگئی ہوں گی۔ اب دیکھئے کہ ریاض کے یہاں یہ تغزل کس طرح اور کن ہاتھوں سے پہونچا۔

میر غزل کے امام ہیں۔ ان کے یہاں ہر قسم کی چیزیں آکر جمع ہوگئی ہیں۔ انھیں سے دوسرے شاعر بقدر ذوق اور حسب استعداد مستفید ہوئے ہیں۔ انکا تغزل نہ محض عاشقانہ ہے، نہ محض رندانہ، نہ محض ناصحانہ اور نہ محض حکیمانہ۔ یہ سب کا ایک فن کارانہ مرکب ہے۔ اس میں رنگ زیادہ نہیں ہیں مگر رنگوں کی آمیزش اور اُن کے تناسب میں مصور نہایت چالاک واقع ہوا ہے۔ میر کے بعد تغزل کا یہ تناسب کسی اور سے نبھ نہ سکا۔ جو رنگ سورج کی کرن میں آکر بے رنگ اور خالص بن گئے تھے وہ پھر بکھر گئے اور بعد کے شعرا کو خاص خاص رنگ ہاتھ آئے۔ جرأت نے عاشقانہ معاملات پر زور دیا (واضح رہے کہ میر جرأت کے رنگ کو چوما چاٹی کہتے تھے کیونکہ جرأت کا رنگ باوجود حقیقی ہونے کے میر کے مقام سے گرا ہوا تھا) مصحفی خارجیت کی طرف آئے، نظیر اس دائرے میں سے نکل بھاگے، انھیں اس رچی ہوئی فضا میں اپنا دم گھٹتا ہوا معلوم ہوا، آتش، رند، نسیم، انیس، میر سے دور اور لکھنویت سے قریب ہوتے گئے، دہلی کے شعرا میر کے رنگ سے آشنا تھے، مگر وہ بھی لکھنؤ سے متاثر ہوئے۔ غالب، میر کے رنگ کو سمجھتے تھے مگر اُن کی اپنی فطرت اُنھیں ایک ایسی ماورائیت کی طرف لے جاتی تھی۔ جہاں میر کا ساتھ بھی چھوٹ جاتا تھا مومن کے ساتھ اُردو کے نقادوں نے بڑی بے انصافی کی ہے، مگر اُس سے زیادہ خود مومن نے اپنے ساتھ کی ہے۔ اُنھوں نے اپنے آرٹ سے اپنے نقطۂ نظر کو اس درجہ دھندلا کر دیا کہ وہ چیستاں بن کر رہ گیا۔ اُنیسویں صدی کے وسط میں غزل کی علامات تو وہی تھیں جو میر نے بخشی تھیں مگر اُن کی گہرائی اور سچائی ویسی نہ رہی تھی جیسی میر کے یہاں۔ داغ نے لال قلعے میں شاعری شروع کی۔ ان کی شاعری اچھی خاصی ترقی کر چکی تھی کہ غدر ہوگیا، غدر سے وہ متاثر بھی ہوئے اور غزل ہی کی زبان اور اس کی علامات میں اُنھوں نے ان تاثرات کا اظہار بھی کیا، مگر اُنکا اپنا مزاج لال قلعہ کی رنگین فضا میں بن چکا تھا۔ چنانچہ اُنھوں نے تغزل میں ایک خاص شوخی پیدا کی۔ یہ شوخی ان کی اپنی طبیعت، اپنی زندگی اور اپنی آپ بیتی سے پیدا ہوئی اس میں اور مثلاً غالب کی شوخی میں فرق ہے۔ غالب کی شوخی ذہنی مسرت کا سامان بہم پہونچاتی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی بیماری کی داستان بھی پر لطف معلوم ہوتی ہے، یہ شخص تکلیف میں بھی اپنے اوپر ہنس سکتا تھا۔ داغ کی شوخی، جوانی، رندی، اور بدمستی کی شوخی ہے۔ یہ غزل کی زبان اور علامات کی جامعیت ہے کہ داغ کو اس کے لئے کوئی نئی زبان ایجاد نہیں کرنی پڑی، نہ کوئی نئی علامات وضع کرنی پڑیں۔ داغ بڑے شاعر تھے، چونکہ وہ سچے شاعر تھے، لیکن اُن کی شاعری بڑی شاعری نہیں ہے، کم از کم جس شاعری کے لئے بقول اُنکے ایک سوانح نگار کے حیدر آباد کے قیام میں ایک طوائف کو نوکر رکھ کر بڑھاپے میں جوانی کا بھرم رکھنا پڑے تاکہ شعر گرم ہوسکیں، وہ شاعری شروع سے آخر تک بڑی نہیں ہوسکتی۔ مگر وہ امیر کی شاعری سے ضرور بڑی ہے کیونکہ داغ کی یہ زندگی تھی اور امیر کی شاعری۔ امیر بڑے صاحب فن ہیں۔ وہ کانٹے کی تلی زبان لکھتے ہیں، کبھی کبھی وہ مزیدار باتیں بھی کہہ جاتے ہیں مگر اُن کی نعتیہ شاعری میں اُن کی رندانہ شاعری سے زیادہ صداقت ہے۔ داغ نے چھیڑ چھاڑ کو ایک فن بنالیا، اُنھوں نے محبوب اور واعظ دونوں سے چھیڑ چھاڑ برابر جاری رکھی۔ داغ کی شوخی، اُن کے خمریات، اُن کی زبان تینوں کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔ داغ نے تغزل کو میر کے تغزل سے زیادہ محدود، زیادہ عیش پرست اور زیادہ loud) بنادیا۔ اُن کی شراب کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے مگر جلد اُتر بھی جاتا ہے۔ خود اُن کی آخری عمر میں یہ نشہ بہت ہلکا رہ گیا تھا۔

ریاض نے جب آنکھیں کھولیں تو ان کے سامنے وہی داغ کا تغزل تھا جس کی رو میں اُن کے اُستاد امیر اور جلال اور امیر اللہ تسلیم وغیرہ بہے جارہے تھے۔ اُنھوں نے بھی اسی کی پیروی کی اور داغ کے رنگ میں اگر وہ داغ سے بہتر نہیں تو داغ کی صف میں ضرور ہیں اور بعض باتوں میں تو وہ یقیناً داغ سے بڑھے ہوئے ہیں۔ ریاض کی دنیا در اصل اُنھیں عناصر سے بنی تھی جن سے میر کی دُنیا بنی تھی، مگر میر سے ریاض تک اتنا زمانہ گزر چکا تھا کہ بعض نقوش دھندلے ہوگئے تھے اور بعض دوسرے نقوش زیادہ نمایاں تھے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ وہ رکھ رکھاؤ، وہ ضبط و نظم، وہ خاموش گریہ، وہ ہلکا سا وار جو قوت کی کمی نہیں، مشاق ہاتھ کی پختگی کو ظاہر کرتا ہے، صرف میر کو نصیب تھا، اوروں نے ذوق کی زبان میں صرف رو کر یا ہنس کر گزاری۔ داغ کی ہنسی متعدی تھی۔ ریاض کا کلام بھی اسی کے اثر سے زعفران زار ہے۔

داغ کی طرح ریاض کی بھی نمایاں خصوصیت شوخی ہے۔ داغ ہی کی طرح اس شوخی کا بڑا فیاضانہ استعمال زاہد، ناصح، شیخ پر ہوتا ہے۔ داغ بھی محبوب کے حضور میں کچھ کم بے باک نہ تھے مگر ریاض کے ہاتھ داغ سے زیادہ چلبلے ہیں۔ پھر ریاض داغ سے زیادہ اپنے اوپر شیر ہیں۔ ان تینوں چیزوں کی مثالیں ملاحظہ کیجئے زاہد، ناصح یا واعظ سے شوخی:-

چوری گیا ہے رات کوئی میکدے میں خم،
نکلا ہے نام زاہد شب زندہ دار کا

پی پی کے اُس نے سجدے کئے ہیں تمام رات
اللہ رے شغل زاہد شب زندہ دار کا

شاخ میں جب تک یہ ہے انگور ہے — شیخ نے توڑا کہ مینا ہو گیا،
سایۂ تاک میں واعظ کو جگہ دی ہم نے — آج شیشے میں اُسے ہم نے اُتارا کیسا
قرض لایا ہے کوئی بھیس بدل کر شاید — مے فروشوں کا ہے واعظ سے تقاضا کیسا
ہمیں پینے پلانے کا مزا اب تک نہیں آیا — کہ بزم مے میں کوئی پارسا اب تک نہیں آیا
اُن چُن کے آج شیخ نے انگور کھائے — اب کیا کھنچے گی تاک کا حاصل نکل گیا
اِدھر اُدھر بہت آنے لگا ہے منہ واعظ — ذرا اسے کہیں رند و مزا چکھا دینا
جسے یہ بادہ خوار تھے سُن سُن کے پی گئے — واعظ کو کچھ مزا نہ کسی نے چکھا دیا
دھوکے سے پلا دی تھی اُسے بھی کوئی دو گھونٹ — پہلے سے بہت نرم ہے واعظ کی زباں اب
وزیر تاک کھولا، واعظ بہت ہی چوکا — بیلوں نے داڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں تھوکا
پہنچے میخانے میں کیوں پہنچے تھے حضرت شیخ — کہئے اچھی تو کٹی قبلۂ حاجات کی رات
جام چھلکانے لگے بھر کر مئے کوثر سے آپ — حضرت واعظ بہت اُونچے گئے ممبر سے آپ
شیخ کے سر پہ ایک لگائی تڑاق سے — پھر ہاتھ مل رہے ہیں کہ اچھی پڑی نہیں
اب شیخ نے جب پی تو منہ بنا کے کہا — مزا بھی تلخ ہے کچھ بو بھی خوشگوار نہیں
واعظ کیسے مزے میں ہیں واعظ — بھرے جام کوثر کے چھلکا رہے ہیں
بہکے توڑنے میں بھی آتا نہیں ہے لطف — جب تک شریک بادہ کوئی پارسا نہ ہو
مقاموں سے ہے پوشیدہ تعلق جن کا — راستے ایسے گئے ہیں کئی میخانے کو
مئے کوثر جناب شیخ پئیں، — ایسی شے اور نا روا جائے
رحمت نے شراب کا ذکر اس قدر کیا — واعظ کے منہ سے آنے لگی بو شراب کی
تو ہو بیان میں واعظ شگفتگی — ہم رندوں کے قلقلِ مینا کہیں جسے
شیخ نے مانگی ہے اپنی عمر کی — میکدے سے اب پرانی جائے گی
کے نصف شب کو در میکدہ کھلا — مانگی ہے اک بزرگ تہجد گزار نے
جنے گئے ہم بادہ کشوں کے ہمراہ — آج جنت میں ہمیں ناصح منصور ملے

قول سے شوخی :

اک کہیں دو دو فرشتے بھی لدے — اور پھر عصیاں کا بھی بار گراں بالائے سر
ڈھونڈھ ڈھونڈھ کے کرتا ہوں رات دن — لکھیں تو کاتبانِ عمل پر عذاب ہو

کاتبِ اعمال نکلے کام کے — مل گئے دو دو شریک الزام کے

محبوب سے شوخی :

ریاض اک چلبلا سا دل ہو ہم میں — حسینوں کی بھری محفل ہو ہم ہوں
پاؤں تو ان حسینوں کا منہ چوم لوں ریاض — آج ان کی گالیوں نے بہت ہی مزا دیا
کوئی منہ چوم لے گا اس نہیں پر — شکن رہ جائے گی یونہیں جبیں پر
جوانی خود آتی ہے لو حُسن بن کر — جواں کوئی ہو ہم حسیں جانتے ہیں
چھیڑتے ہیں ہمیں معشوق پُرا کرتے ہیں — ہم بھری بزم میں منہ چوم لیا کرتے ہیں
یہ سیدھے جواب زلفوں والے ہو رہے ہیں — ہمارے ہی سب بل نکالے ہوئے ہیں
پائیں تو لے حسینوں تم کو رُلا کے چھوڑیں — ہیں یہ ریاض ایسے ان کو ترس نہ آئے
کسی سے وصل میں سنتے ہی جان سوکھ گئی — چلو ہوا بھی ہماری زبان سوکھ گئی
ہم نے بھی ان حسینوں کو چھیڑا ہے کس قدر — ایسا بھی کوئی ہے جو ہمیں کوسنا نہ ہو
نشے سے جھکی پڑتی ہیں یونہیں تری آنکھیں — چھیڑوں سے مری اور بڑھا بوجھ حیا کا

اپنے متعلق شوخی :

یہ اپنی وضع اور یہ دُشنام مے فروشی — سُنکر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا
مے چرانے میں ہمیں ہے ید طولےٰ کیسا — ہم اُڑا لائے سبو آج اچھوتا کیسا
بیچی داڑھی نے آبرو رکھ لی، — قرض پی آئے اک دُکان سے آج
بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن — ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں
نظر بچائے بغل میں دبائے شیشۂ مے — کہیں ریاض یہ پینے پلانے جاتے ہیں،
کر سیدھی کرنے ذرا میکدے میں، — عصا ٹیکتے کیا ریاض آ رہے ہیں
اُٹھے کبھی گھبرا کے تو میخانے کو ہو آئے — پی آئے تو پھر بیٹھ گئے یادِ خدا میں
وہ بیٹھے ریاض آج تو کچھ جھوم رہے ہیں — اب یہ بھی گنے جاتے ہیں مردانِ خدا میں
سنا ہے ریاض اپنی داڑھی بڑھا کر — بڑھاپے میں اللہ والے ہوئے ہیں

شرما ؤ ریاض میکشی سے — لمبی داڑھی ہے ہاتھ بھر کی
چھیڑ کیسی، بات کہتے روٹھ جاتے ہیں ریاض — اک حسیں ہر وقت ہو ان کے منانے کے لئے
یہ عالم ہے ریاض ایک ایک قطرے کو ترستا ہوں — حرم میں اب خدا جانے بھری بوتل کہاں رکھدی

میں نے جان بوجھ کر ریاض کی شوخی کی کافی مثالیں دی ہیں۔ یہ ریاض کا خاص مضمون ہے۔ اس کے علاوہ ریاض کا دوسرا کمال خمریات یعنی شراب کے مضامین باندھنا ہے۔ شوخی اور شراب کا ایک خاص تعلق ہے۔ غالب کے یہاں خمریات اور شوخی دونوں کے بڑے اچھے نمونے ملتے ہیں۔ میں نے خمریات کی عام تقسیم کے بجائے کچھ بہت سے اشعار زاہد یا شیخ سے شوخی کے تحت میں بیان کر دئے ہیں۔ شوخی کے سلسلہ میں اب غالباً سوائے اس کے اور کچھ کہنے کی ضرورت نہ رہے کہ داغ اور بیخود نے شوخی ختم ہو گئی ہے۔ داغ کی شوخی میں تیزی زیادہ ہے، اس میں دھول دھپے کا سا انداز ہے، ریاض کی شوخی ایک ایسا مزا رکھتی ہے جو دیر تک ہے، یہ زیادہ متوازن اور ہمہ گیر بھی ہے۔

خمریات کے متعلق مولوی سبحان اللہ کا بیان ہے کہ ریاض کے یہاں ۱۳۶۶ - اشعار اس مضمون کے متعلق ملتے ہیں - میں نے ان کا شمار نہیں کیا لیکن یہ واقعہ ہے کہ کسی شاعر کے یہاں شراب اور شراب کے مضامین شاید اس قدر کثرت سے بیان نہ ہوئے ہوں - اس مضمون کے شروع میں یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ریاض کی مستی اگرچہ زیادہ تر اس دنیا کی چیز معلوم ہوتی ہے، مگر اس میں بادہ تصوف کی چاشنی بھی کافی ہے - پھر اس رنگ میں زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی ترجمانی بھی بڑے مزے سے ہوئی ہے - مثلاً جنگ عظیم کے بعد گرانی کا ذکر ریاض نے مے کے گراں ملنے اور اُدھار نہ ملنے کے پیرائے میں کیا ہے - نیز اس قسم کے اشعار صرف میکدے کی دنیا میں ہی نہیں ہماری آپ کی دنیا میں بھی صداقت رکھتے ہیں ؎

جو ہم آئے تو بوتل کیوں الگ پیرِ مغاں رکھدی — پرانی دوستی بھی طاق پر اے مہرباں رکھدی

چھ سات برس ہوئے علی گڈھ میں ایک بڑا معرکۃ الآرا جلسہ تھا - ایک پارٹی والوں نے فیصلہ اپنے موافق کرانے کے لئے ایک صاحب کا نام صدارت کے لئے تجویز کیا، اِدھر تجویز ہوئی اُدھر وہ صاحب جھٹ سے جاکر کرسی صدارت پر بیٹھ گئے - دوسری پارٹی والے ہاں ہاں کرتے رہے مگر جو بیٹھ گیا ہو اُسے کون اُٹھا سکتا ہے - چنانچہ تمام فیصلے پہلی پارٹی کے حق میں ہوئے، ایک اور صاحب جو اس تماشے کو ذرا دور سے دیکھ رہے تھے، شاد کا یہ مشہور شعر پڑھتے ہوئے چلے آئے ؎

یہ بزمِ مے ہے یاں کوتاہ دستی میں ہے محرومی — جو بڑھ کر خود اُٹھا لے ہاتھ میں مینا اُسی کا ہے

اب غالباً یہ واضح کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ مے و مینا کے پردے میں کیا کچھ بیان نہیں ہو سکتا - ریاض نے بھی بہت کچھ بیان کیا ہے، مگر اُن کے سب سے اچھے اشعار وہ ہیں جہاں وہ شراب کا مزہ، اُس کی تاثیر، ساقی کی مہربانی، میکدے کی رونق، رندوں کا پینا پلانا اور زاہدوں کا للچانا، شراب کے نام، اُس کی تشبیہات سب کا ذکر کرتے ہیں - ریاض کی اس خصوصیت پر تمام نقادوں نے زور دیا ہے، اس لئے میں اُن کے بعض اچھے اشعار اس سلسلے میں پیش کر کے آگے بڑھنا چاہتا ہوں - بہت سے اشعار شوخی کے ذیل میں بھی آگئے ہیں :-

کہکے اس میں زہر بھی ہے کچھ ملا ہوا — ساقی نے جب پلائی تو نشہ سوا ہوا

میں کہیں جاؤں وہ محشر ہو کہ محفل وعظ — دوش پر میرے سبو ہاتھ میں مینا ہوگا

جا چکے بزم وعظ میں سو بار ہم نے پی — چوری کسی کی تھی نہ ہمیں ڈر کسی کا تھا

اب تم بھی آکے ہوئے تھے شریکِ دور — کچھ اور رنگ آج مری مے کشی کا تھا

ہم ہیں گدائے میکدہ ہم کو کمی نہیں — سب کچھ ہمارے گھر ہے خدا کا دیا ہوا

غضب آیا تو میں خُم پر گرا — خُم گرا، مینا گرا، ساغر گرا

توبہ سے ڈرا مجھے ساقی نے یہ کہہ کر — توبہ شکنی کے لئے اصرار نہ ہوگا

کھنا پڑا ہمیں غم و مینا کو سر بہ مہر، — کوئی بھی آدمی نہ ملا اعتبار کا

واعظ نہ آپ بزم میں چھلکائیں جامِ خلد — گھلوائیں منہ جناب نہ مجھ بادہ خوار کا

شے میں گر کے ہاتھ سے ساغر ہوا چور — ہر ریزہ جا کے سبزہ لب آبجو ہوا،

وبہ کر کے آئے پھر پی لی ریاض، — کیا کیا کم بخت تو نے کیا کیا

رے ساغر میں ہے بھرپور امنگ جوانی کا — غضب ہے بے پئے نشے میں میرا چور ہو جانا

یاض توبہ کر و دن خزاں کے آئے ہیں، — تم آئے پینے کو جاتی ہوئی بہار میں کیا

نت سے کم سہی مگر اچھا تھا میکدہ — جب تک وہاں تھے ہم غم فردا تو کچھ نہ تھا

م رند سمجھتے ہیں اُسے انجمن واعظ — جس بزم میں ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

خانے میں کیوں یادِ خدا ہوتی ہے اکثر — مسجد میں تو ذکرِ مے و مینا نہیں ہوتا

ے ہمارے آگے وہ ساغرِ شراب کا — ساقی نے جس میں رنگ بھرا ہو شباب کا

وہ جانا مرا روٹھ کر میکدے سے — صراحی کا مجھ کو وہ آواز دینا

تا صبح میکدہ سے رہی بوتلوں کی مانگ — برسیں کہاں یہ کالی گھٹائیں تمام رات

کیا سبک، صاف، لطیف ابلی کھنچی ہے ساقی — مے تو مے، نکہت گل بنکے اُڑے گی تلچھٹ

کس مزے کی ہوا میں مستی ہے — کہیں برسی ہے آسمان سے آج

یہ سرخ سرخ سی شے اک سیاہ بوتل کی — بغیر ابر بھی ہے سبزہ زار کے قابل

میرا یہی خیال ہے گو میں نے پی نہیں — کوئی حسیں پلائے تو شے بُری نہیں

مے توبہ کے گزری ہے اک عمر مگر — ہے وہی لطف وہی رنگ وہی بو ہنوز میں

موجِ مے شاید پر پرواز ہے — اُڑ کے آجاتی ہے میرے جام میں

خانقا میں تو ہزاروں ہیں مگر جی بھی لگے — کوئی تھوڑی سی جگہ دیدے پس خم مجھ کو

دھڑکے محشر کے مٹانے کو مرے ساقی نے — مرتے مرتے بھی پلائی ہے کئی خم مجھ کو

بند ہوتا ہے اب درِ توبہ، — درِ میخانہ وا کرے کوئی،

چھلکائیں لاد بھر کے گلابی شراب کی — تصویر کھینچیں آج تمہارے شباب کی

یہ سربمہر بوتلیں ہیں جو شراب کی — راتیں ہیں ان میں بند ہمارے شباب کی

ے و معشوق نہیں آپ میں رہنے دیتے — بعد توبہ بھی بدل جاتی ہے نیت میری

عمر بھر لوٹے جوانی کے مزے — اے میں صدقے بادۂ گلفام کے

مر گئے پھر بھی تعلق ہے یہ میخانے سے — میرے حصے کی چھلک جاتی ہے پیمانے سے

شغل مے اور معاصی سے ہے اچھا زاہد — غم دنیا سے فراغت تو ذرا ہوتی ہے

یہ کیا مذاق فرشتوں کو آج سوجھا ہے — ہجوم حشر میں لے آئے ہیں بلا کے مجھے
توبہ سے ہماری بوتل اچھی، — جب ٹوٹی ہے جام ہوگئی ہے
کچھ زہر نہ تھی شراب انگور — کیا چیز حرام ہوگئی ہے
جام مے توبہ شکن، توبہ مری جام شکن — سامنے ڈھیر ہیں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے
ہزاروں جام بھرے، لاکھ خم کرے خالی

ارے ساقی ذرا میری شراب تلخ تو لانا — مے کوثر تو بالکل انگبیں معلوم ہوتی ہے
میرے ساقی تیرے تبسم سے — جام چھلکے، چھلک پڑے خم سے
اچھی پی لی، خراب پی لی، — جیسی پائی شراب پی لی
بن بن کے عمر رفتہ کچھ آتا تھا دور جام — تلخی اسی کی آج شراب کہن میں تھی
مزے کی شے ہے ذرا سا مرا سبو کیا ہے

شوخی اور شراب کے مضامین کے علاوہ ریاض کی زبان کی صحت اور ریاض کی زبان کا لطف قابل ذکر ہے۔ نیاز نے ٹھیک کہا ہے کہ شاید ریاض کے برابر صحیح شعر کسی اور نے نہیں کہے، ریاض کی زبان مستند بھی ہے اور پر لطف بھی۔ انھوں نے اپنے بہت سے اشعار میں محض کسی لفظ کے برمحل استعمال، یا کسی محاورے کی موجودگی سے جان ڈال دی ہے۔ محاورہ لکھنا شاعر کا کمال نہیں، لیکن محاورے سے شعر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ ریاض ہر لفظ کو تولتے ہیں اور ایک لفظ کی رعایت پورے شعر میں ملحوظ رکھتے ہیں، اس کی وجہ سے کبھی کبھی شاعری "مرصع سازی" ہو جاتی ہے، مگر یہ واقعہ ہے کہ رعایت لفظی کے باوجود شعریت ریاض کے یہاں اکثر پائی جاتی ہے۔ رعایت لفظی بڑی اچھی اور کارآمد چیز ہے مگر اس رعایت کا باقاعدہ التزام لکھنوی شعرا نے اپنی زندگی کا سب سے بڑا فریضہ قرار دیکر شعریت پر ایک بند باندھ دیا اس دور کے شعرا نے اس سے بیزار ہو کر لفظی تزاج (Amarchy) شروع کر دیا۔ محاورے کے برمحل استعمال اور الفاظ کی مناسب رعایت سے شعر کیسا معلوم ہوتا ہے۔ ریاض کے چند اشعار سے واضح ہوگا۔

کعبہ سنتے تھے کہ گھر ہے بڑے داتا کا ریاض — زندگی ہو تو فقیروں کا بھی پھیرا ہوگا
مزے لوٹو کلیم اب بن پڑی ہے — بڑی اونچی جگہ قسمت لڑی ہے
یہ اپنی وضع اور یہ دشنام مے فروش — سنکر جو پی گئے یہ مزا مفلسی کا تھا
تیغ ہی کیا ہاتھ میں ساقی کے تھی — اے حنا تو بھی تو ساقی جائے گی
یہ ساغر میں ساقی نے کیا چیز دیدی — کہ توبہ ہوئی پانی پانی ہماری
مجبور فرشتہ ہے بدی کا — پہلے ہی سے کچھ کہی بدی ہے
چڑھی ہے بچے گھڑے کی ایسی بندھی ہے یہ دھن ہمیں بھی ساقی

بھرے خم کی طرح ہم میکدے سے اٹھ نہیں سکتے — یہاں بھی ہم جو بیٹھے ہیں تو لاکھوں میں کے بیٹھے ہیں
خیال شب غم سے گھبرا رہے ہیں، — ہمیں دن کو تارے نظر آ رہے ہیں
عنادل میں صبا میں چل گئی تھی — اڑا دی بات پھولوں نے ہنسی میں
جام چھلکانے لگے بھر کر مے کوثر سے آپ — حضرت واعظ بہت اونچے گئے ممبر سے آپ
ادھر اُدھر بہت آنے لگا ہے منہ واعظ — ذرا اسے کہیں رند و مزا چکھا دینا

چکھائیں واعظ کو آج ہم بھی ذرا مزا شہد و انگبیں کا

بعض اشعار میں رعایت، چستی اور صحت کی خاطر، ضرورت سے زیادہ ریاض کیا گیا ہے۔ اس دور میں ذوق سلیم اس قدر کوکنی کے بعد اس بے حاصلی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ؎

منہ زیر تاک کھولا واعظ بہت ہی چوکا — بیلوں نے داڑھی پکڑی خوشوں نے منہ میں تھوکا
لاشہ ہے میرا یا مے رنگیں کی موج ہے — تربت مری ہے یا کوئی بوتل شراب کی

اور یہی رعایت جب حد سے زیادہ بڑھ جائے تو بدمذاقی کی ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں ؎

دعوت تھی رقیب کی مرے گھر — جوتی میں دال کیا بٹی ہے
یہ تو کہا تجھے ہو لہو تھوکنا نصیب — تم نے کبھی دیا کوئی ٹکڑا بھی پان کا
شریک شکار لب جو تھا ناصح — مجھے فاز اُسے روغن قاز دینا

گالیاں بھی نہیں تقدیر میں اُنکے منہ کی — اُنکے دہاں کبھی دو چار سنا دیتے ہیں
قورما مرغ سحر کا وصل میں — بھیج دیتا ہوں موذن کے لئے
لجائے جس کسی کو دیکھ لالوں لال ہے — کیا چیز ان حسینوں کے منہ کا گال ہے

یہ خرابی داغ اور امیر کے یہاں بھی موجود ہے، رعایت لفظی جو اعتدال کے ساتھ اچھی معلوم ہوتی ہے، جب انتہا تک پہونچ جائے تو بدمذاقی ہو جاتی ہے، مگر ریاض کے یہاں علاوہ صناعی کی اس کمزوری کے، ایک اور کمزوری ہے۔ یہ کمزوری بھی داغ اور امیر کے یہاں بہت نمایاں ہے۔ یہ بزرگ صرف چھیڑ چھاڑ پر بس نہیں کرتے بلکہ دست درازی بھی شروع کر دیتے ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگ یہ کہیں کہ ترقی پسندی کے اس دور میں جبکہ جنسی تعلقات کا بھی تجزیہ کیا جاتا ہے، ریاض جیسے بزرگوں کی دست درازی کیوں ناگوار سمجھی جائے۔ مگر دراصل اس دور کی برہنگی انھیں بزرگوں کا عطیہ ہے۔ صرف اس کا نام بدل گیا ہے۔ پہلے لوگ واسوخت یا معاملہ بندی یا سراپا یا برسات کی بہاروں کے سائے میں برہنہ ہوتے تھے، پھر ادب لطیف یا آرٹ کے نام پر، اب اسی کمزوری کا اظہار ترقی پسندی کے پردے میں ہو رہا ہے

ترقی پسندوں کو الزام دینے سے پہلے اثر کی خواب و خیال، شوق کی مثنویوں کے بعض ٹکڑے، مومن کی بعض خوش فعلیاں، داغ اور ریاض کے بعض اشعار بھی نکالنے پڑیں گے ( ) ادب یا آرٹ نہیں ( ) ہی ہے۔

ریاض اور بعض شعرا کے متعلق تو یہ عذر کیا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ گرتے گرتے سنبھل جاتے ہیں۔ ہمارے بعض نام نہاد ترقی پسند حقیقت نگاری کے زعم میں کہیں بس نہیں کرتے۔ بہر حال ریاض کے اشعار میں یہ میلان بہت نمایاں ہے۔ بوسے بازی، حسینوں کو ستانا، گھنگھرو کی آواز آتے ہی گود میں اٹھانے کے لئے بے تابی جوبن، محرم، سینہ کا تناؤ، ان سب کا ذکر بکثرت ہوا ہے۔ مضمون لمبا ہوا جا رہا ہے اس لئے میں دو قسم کی مثالیں دیکر آگے بڑھنا چاہتا ہوں۔ کچھ اشعار ایسے ہیں جن میں ابتذال اور عریانی کے سوا اور کچھ نہیں۔

کسی سے وصل میں سنتے ہی جان سوکھ گئی — چلو ہٹو بھی ہماری زبان سوکھ گئی،

آرسی ہیکل کو چوم لے گی — وہ چیز جو کچھ کچھ اٹھی اٹھی ہے

چوڑیاں ٹوٹی ہوئی سسکی قبا، صورت نڈھال، — غیر کے گھر کیا تجھی کم بخت کے ماتم میں تھے

جو بے حجاب کہیں سینہ تانے جاتے ہیں — کھلے خزانے وہ جوبن لٹانے جاتے ہیں

اب ذرا ان اشعار کو دیکھئے؟

وصل کی شب اتنے چوسے اُن کے لب — لذت اب باقی نہیں دشنام میں

دوڑ کر گود میں اٹھا لاؤں — گھر میں چھم سے جو کوئی آجائے

اس ابھرے ابھرے جوبن پر وہ یونہیں بیٹھے رہ جاتے — انھیں اٹھتی جوانی کا مزا اب تک نہیں آیا

بازار میں بھی چلتے ہیں کوٹھوں کو دیکھتے — سودا خریدتے ہیں تو اونچی دکان کا

بوسے لینے میں یہ سمجھے ہم گلوری ہے دبی — گالیاں لاکھوں بھری تھیں پھولے پھولے گال میں

کوئی جاتا ہو چھڑے پنے کہیں — گود میں اپنے اٹھا لاتے ہیں ہم

جب جھم سے چلیں گود میں چپکے سے اٹھا لو، — اس طرح کہ گھنگھرو کوئی چھاگل کا نہ بولے

ہم کو ملجائیں تو آجائے مزا — اچھے معشوق اور سستے دام کے

رہے سینہ تنا لنگر سے اُس کے — یہ چوٹی اس سے پیچھے پڑی ہے

گالیاں کھائے تو مزے کے ساتھ — گورے گال اُن کے چومتا جائے

یہی وجہ ہے کہ ریاض جیسے صحیح کہنے والے، مزیدار کہنے والے اور گدگدی پیدا کرنے والے شاعر کے ساتھ بھی ہم بہت دور تک نہیں جا سکتے اور بہت دیر تک نہیں رہ سکتے، ادبی رفاقت کی صلاحیت تو شاید دو ہی ایک شاعروں میں نکل سکے۔ ریاض جتنی دیر ہمارے ساتھ رہتے ہیں، زندگی کا لطف کچھ زیادہ معلوم ہوتا ہے، دنیا زیادہ حسین ہو جاتی ہے، محبوب کے جلوے زیادہ روشن معلوم ہوتے ہیں۔ تلخ اور ناکام زندگی زیادہ گوارا ہونے لگتی ہے، شباب اور زیادہ جوان ہو جاتا ہے، مگر ریاض ہی کے الفاظ میں، اس کے بعد کچھ یہ بھی احساس ہوتا ہے ؎

صد سالہ دورِ چرخ تھا ساغر کا ایک دور — نکلے جو میکدے سے تو دنیا بدل گئی

آل احمد سرور

ضروری اطلاع اگر آپ نے خط و کتابت میں نمبر خریداری درج نہ کیا تو ہم آپ کو دوبارہ پرچہ بھیج سکتے ہیں۔ نمبر خریداری ہر مہینہ پتہ کی چٹ پر بائیں طرف انگریزی ہندسوں میں درج رہتا ہے۔ اسے کسی جگہ نوٹ کر لیجیے۔

منیجر نگار

دوری

اس فسانہ کے مصنف مجتبیٰ حسین صاحب قارئین نگار کے لئے نئے نہیں ہیں، لیکن افسانہ نویسی کی جو جدید راہ انھوں نے اختیار کی ہے وہ دُنیا کے لئے شاید عرصہ تک نئی رہے گی

ان کے افسانوں میں پلاٹ کی جستجو نہ کیجئے، بلکہ صرف یہ کہ وہ جذبات انسانی کی گہرائیوں میں پہونچکر ایک نفسیاتی نکتہ کو کس خوبی سے کھولتے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ اُردو میں اس نوع کی افسانہ نویسی اتنی تکمیل و احتیاط کے ساتھ شاید سب سے پہلے انھوں ہی نے شروع کی ہے اور میں یہ دیکھ کر بہت خوش ہوتا ہوں کہ ان کا یہ ذوق ہمیشہ روز بروز نہایت صاف، ستھرا اور دلنشین ہوتا جاتا ہے۔

نیاز

پہلے پہل جب انھوں نے ایک دوسرے کو دیکھا تو انھیں محسوس ہوا کہ انھوں نے دیکھا ہی نہیں ـــــ کچھ عجیب سی بات ہے مگر انھیں محسوس یہی ہوا۔ یہ پہلا اتفاق تھا جب دونوں ایک چھوٹی سی مقامی انجمن کے جلسہ کے سلسلے میں ملے۔ حبیب کو ایک مضمون پڑھنا تھا جس کو ختم کرکے وہ جلد از جلد گھر بھاگ جانا چاہتا تھا۔ اسی اثنا میں وہ بھی داخل ہوئی ـــــ کسی نے تعارف کرا دیا۔ حبیب نے یونہی ہاتھ ملا لیا اور فریدہ نے بھی کسی خاص گرمجوشی کا اظہار نہیں کیا۔ حالانکہ اس سے قبل بھی وہ حبیب کا نام سُن چکی تھی۔ اور اس کی تنہا پسندی کے بارے میں عجیب و غریب مضحک روایتیں اس کے دوستوں نے بیان کی تھیں۔ حبیب اپنے اس محدود حلقہ میں کافی مقبول تھا ـــــ مختصر سے تعارف کے بعد دونوں ایک دوسرے کو تقریباً بھلا چکے تھے۔ حبیب مضمون پڑھنے میں مصروف تھا اور فریدہ آنکھیں جھکائے چپ چاپ سُن رہی تھی یا سوچ رہی تھی ـــــ اس دوران میں انھوں نے صرف ایک مرتبہ دیکھا۔ دونوں کی آنکھیں ملیں ..... مگر دونوں اس طرح دیکھ رہے تھے گویا وہ خود سے علٰحدہ دور کسی تیسری چیز کو دیکھ رہے ہیں۔ ان کی نظریں چہروں پر نہیں تھیں ـــــ سامنے حبیب کا لمبا۔ زرد اور قدرے بدنما چہرہ اور فریدہ کی چھوٹی چمکدار۔ خاموش آنکھیں نہ تھیں۔ بلکہ ایک وسیع۔ لامحدود گمنام سا خلا جہاں دھندلے دھندلے دو سائے متحرک ہیں اور وہ ان کو پہچاننے میں منہمک! ـــــ یہ سب صرف چند سکنڈ میں ہوا اور پھر ان کی گم شدگی ختم ہو گئی۔ اب انھیں ایک دوسرے کا چہرہ صاف نظر آ رہا تھا۔ حبیب نے محسوس کیا وہ فریدہ کو نہیں دیکھنا چاہتا ہے اور فریدہ بھی یہی محسوس کر رہی تھی کہ اب اگر وہ زیادہ دیر تک دیکھے گی تو حبیب کا چہرہ اسے بدنما معلوم ہونے لگے گا ـــــ اتنا بدنما کہ وہ اسے برداشت نہیں کر سکتی ـــــ اس نے سوچا "وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے مگر یہ نہیں کہ حبیب کا چہرہ اسے بدنما معلوم ہو۔" رفتہ رفتہ ان کی شخصیتیں ان پر پھر حاوی ہو گئیں۔ دو زبردست شخصیتیں جن میں بظاہر کوئی واسطہ نہیں۔ کوئی موافقت نہیں۔ کوئی اتحاد نہیں۔ جلسہ ختم ہوا۔ لوگوں نے اپنے اپنے گھروں کی راہ لی ـــــ اُس دن کے بعد وہ ہار ہا ملے اور جوں جوں ملاقاتوں کا سلسلہ بڑھتا گیا وہ قریب تر ہوتے گئے۔ مگر کبھی کبھی انھیں محسوس ہونے لگتا کہ جیسے انھوں نے غلط راستہ اختیار کیا ہے۔ ان کے ملنے کا یہ طریقہ غلط ہے۔ وہ ملنا تو چاہتے ہیں مگر اس طرح نہیں۔ بعض اوقات یہ احساس اتنا شدید ہو جاتا کہ وہ طے کر لیتے کہ اب ایک دوسرے سے ملیں گے ہی نہیں۔ خصوصاً اُس رات جب وہ دونوں ساتھ آ رہے تھے۔

حبیب نے کہا "فریدہ!"

"جی!" ـــــ مگر لہجہ میں بڑی غنودگی تھی۔ دونوں کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ مگر وہ محسوس کر رہے تھے کہ جیسے وہ ایک دوسرے کے چہرے کو دیکھ رہے ہیں جذبات کا اندازہ لگا رہے ہیں۔ ذرا دیر سکوت رہا۔

حبیب نے پھر کہا "ہم لوگ ....." اور اتنا کہہ کر رک گیا۔ فریدہ۔ بالکل خاموش تھی۔

اس نے پھر پوچھا "کہئے تم نے؟" حالانکہ حبیب نے اب تک کچھ کہا ہی نہیں تھا۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ حبیب ابھی تک سویا نہیں تھا۔ وہ اسی اُدھیڑ بن میں تھا۔ اس کے دماغ میں ہزاروں مشینیں ایک ساتھ کھڑکھڑاتی ہوئی چل رہی تھیں..... معلوم ہوتا تھا کہ اس کا دماغ اب پھٹا..... اب پھٹا..... وہ دیوانہ ہو رہا تھا۔ کوئی اس کے کان میں پکار پکار کے کہہ رہا تھا "ہم لوگ محض ایک اتفاق ہیں اور اتفاق کبھی زیادہ عرصہ تک کام میں نہیں لایا جا سکتا۔ یہ سب زندگی کا ایک مذاق تھا — صرف مذاق۔ جس کے بغیر ہم لوگ ادھورے رہ جاتے اور اگر کچھ دنوں یہی حال رہا تو پھر ادھورے رہ جائیں گے۔ ہم پھر وہی ہو جائیں گے — وہ متوسط طبقہ کی ایک کھاتی پیتی ذہین لڑکی اور میں چھوٹا موٹا سا مضمون نگار جسے سوسائٹی محض اس لئے برداشت کر لیتی ہے کہ وہ اپنے مضمون سے تھوڑی دیر کے لئے اس کا دل بہلا دیتا ہے۔ اور بس....." اس نے اپنے کان بند کر لئے، اسے معلوم ہوا کہ ایکدم سے سکون چھا گیا۔ یہ جو تمام دنیا اپنی پوری قوت سے چیخ رہی تھی اب خاموش ہو گئی ہے..... رفتہ رفتہ اس کی آنکھوں سے ایک غمگین عوم جھلکنے لگا — رات دھیرے دھیرے سوتی چلی جا رہی تھی سکوت بہت ڈراؤنے انداز میں دروازے کے باہر سنسنا رہا تھا۔ اسے خوف معلوم ہونے لگا۔ اس نے دروازہ بند کر دیا۔ مگر اسے معلوم ہو کہ دراز سے تاریکیاں اندر جھانک رہی ہیں۔ کچھ دیر وہ دم بخود بیٹھا رہا۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔ آخر کار اس سے نہیں رہا گیا اور فریدہ کے گھر کی طرف چل دیا وہ ایک ایک قدم آہستہ آہستہ رکھ رہا تھا جیسے اس کے قدم خود کسی گہری سوچ میں ہوں — مکان آ گیا اور وہ ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے اوپر نظر اٹھائی کھڑکی کے شیشوں سے ہلکی ہلکی روشنی چھن رہی تھی۔ اُسے ایک دم سے اطمینان ہو گیا۔ اس نے چاہا کہ لوٹ جائے۔ مگر نہ جا سکا۔ وہ عجب پس و پیش میں تھا

"فریدہ!" اس نے دھیرے سے پکارا

ذرا دیر سکوت رہا اور پھر آہستہ سے پٹ کھلا

"چلے آیئے" وہ اندر چلا گیا

"بیٹھ جایئے" وہ بیٹھ گیا۔

— بڑی ہولناک خاموشی چھا گئی۔ وہی خاموشی جس سے وہ ڈرتا تھا۔ شاید فریدہ بھی آج ڈر رہی تھی۔

"ہم کو کبھی نہ ملنا چاہئے"۔ اُس نے فریدہ کو دیکھا — وہ وہاں نہیں تھی — اس نے پھر غور سے دیکھا — کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ "میں کل چلا جاؤں گا"

"کیوں؟" لہجہ سے ایسا معلوم ہوا جیسے وہ کہیں دور سے تھکی ہوئی واپس ہوئی ہے۔ "تم اتنی جلدی اُداس ہو گئیں۔ محض میری دوری کے خیال سے!" اسے خود اپنے الفاظ پر اعتبار نہیں تھا۔ فریدہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ دونوں باہر اندھیرے میں دیکھ رہے تھے۔ جیسے وہاں کائنات کے اُس سرے پر کوئی چیز سرسرا رہی ہے۔ حبیب نے پھر کہنا شروع کیا "ہماری محبت قربت کی متحمل نہیں ہو سکتی" آواز پُراسرار ہوتی چلی جا رہی تھی۔ "ہم ایک دوسرے سے دور ہی رہ کر محبت کر سکتے ہیں — دیکھو۔ اِدھر دیکھو"۔ دونوں نے ایک دوسرے کو دیکھا — بالکل اسی طرح جیسے کوئی بہت فاصلہ پر کسی تیسری چیز کو دیکھ رہا ہو۔ رات سردی سے کانپ رہی تھی۔ خاموشی گہری ہوتی چلی جا رہی تھی اور اس خاموشی میں جیسے کوئی سسکیاں بھر رہا ہو۔ جیسے کوئی کہہ رہا ہو —

"مت جایئے۔ مت جایئے!" ذرا دیر بعد حبیب آہستہ سے اُٹھا اور دروازے کی طرف چل دیا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ خواب میں چل رہا ہے....

"جا رہے ہیں آپ؟" اس نے بغیر مُنہ پھیرے ہوئے پوچھا گویا وہ اندھیرے میں کسی شخص سے سوال کر رہی ہے۔ حبیب نے کوئی جواب نہیں دیا — اور وہ چل دیا — قدموں کی دھیمی دھیمی چاپ — اندھیرا — سردی — اور سناٹا! چند قدم چل کر وہ مڑا۔ اس نے دیکھا۔ ہلکی ہلکی روشنی کی نازک شعاعیں کھڑکی سے نکل کر اس کا تعاقب کر رہی ہیں۔ اس نے قدم ذرا تیز کر دئے..... زمین و آسمان سب اُس سے دور ہوتے چلے جا رہے تھے۔ سیاہ سڑکیں سراسیمگی کے عالم میں بھاگی جا رہی تھیں۔ اسکی طبیعت چاہتی تھی کہ کسی طرح انھیں روک لے مگر وہ رکتی ہی نہیں تھیں — بھاگی جا رہی تھیں — وہ بھاگنے لگا۔ پیچھے مڑ کر دیکھنے سے وہ ڈر رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ کھڑکی سے روشنی نکل نکل کر اس کی رگوں میں سرایت کرتی چلی جا رہی ہے... وہ بھاگتا چلا جا رہا تھا..... اب وہ ہانپنے لگا۔ اس نے ہمت کر کے پیچھے مڑ کر دیکھا — روشنی گل ہو چکی تھی.... وہ چیخا "روشنی کبھی نہیں گل ہو سکتی!" آواز دور تک نکل گئی ایسا معلوم ہوا کہ ساری دُنیا اسے دُہرا رہی ہے اور دور دُور کھڑکی سے بھی یہی آواز آ رہی ہے۔ "روشنی کبھی نہیں گل ہو سکتی!"

مجتبیٰ حسین

دو دن دارالسرور رامپور میں

رامپور سے مجھے اتنا دیرینہ اور اس قدر گہرا تعلق ہے کہ اگر میں اسے اپنا دوسرا وطن کہوں تو غلط نہ ہوگا، ہر چند میرے شباب کی سب سے پہلی رات کا چاند لکھنؤ میں طلوع ہوا، لیکن یہ وہ زمانہ تھا جب جوانی میرے لئے ایک مبہم خواب، ایک ناقابلِ فہم اُلجھن اور ایک بے معنی جستجو سے زیادہ کچھ نہ تھی۔ اس کے بعد ہی قسمت مجھے رامپور لے گئی اور یہاں آکر اس خواب میں رنگینی، اس اُلجھن میں کیفیت اور اس جستجو میں ایک مفہوم پیدا ہونے لگا ـــــ اور دن گزرتے گئے۔ یہاں تک کہ، خیر ـــــ! اب کیا کہوں

رات اور زلف کا یہ افسانہ
قصہ کوتہ بڑی کہانی ہے

زمانہ نے ورق پلٹا اور مجھ سے رامپور ہمیشہ کے لئے چھوٹ گیا، لیکن محبت کے وہ نقوش بدستور قایم رہے۔ اس کے بعد پھر کئی بار وہاں جانے کا اتفاق ہوا اور ہر بار مجھے تکلیف ہوئی، یہاں تک کہ میں نے ارادہ کر لیا اب وہاں کبھی نہ جاؤں گا ـــــ لیکن یہ کیا خبر تھی کہ مجھے اپنا ارادہ توڑنا پڑے گا اور اس طرح کہ یہ ٹوٹی ہوئی توبہ پھر استوار نہ ہو سکے گی ـــــ یہ نہ جانا تھا کہ اُس محفل میں دل رہ جائیگا ہم سمجھتے تھے چلے آئیں گے دم بھر دیکھ کر

یونہ تو بارہا مجھ پر احباب کے تقاضے ہوئے اور میں ہمیشہ ٹالتا رہا، لیکن جنوری کی آخری تاریخوں میں عزیزم خالد کا خط آیا اور نہیں کہہ سکتا کہ اس خط میں کیا تھا کہ میں جانے پر مجبور ہو ہی گیا ـــ پھر اس دو دن کے مختصر قیام میں، کیا کچھ کھو کے آیا اور کیا کچھ لیکر، یہ داستان تفصیل طلب ہے

ایں رشتہ بہ انگشت نہ پیچم کہ دراز ست!

یونہ تو میرا قیام اسلم خانصاحب کے یہاں رہا، لیکن سچ پوچھئے تو میں سارے رامپور کا مہمان تھا اور مجھ پر ہر طرف سے بارش لطف و کرم ہو رہی تھی۔ اسلم خانصاحب سے صرف ایک بار اس سے قبل یہیں لکھنؤ میں ملاقات ہوئی تھی اور میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ اس شخص سے ملنا خطرہ سے خالی نہیں، چنانچہ یہاں پہونچ کر اس کی تصدیق بھی ہو گئی اور اب میں نہیں کہہ سکتا کہ اس دُبلے پتلے بچپن قسم کے نوجوان نے اپنے خلوص سے مجھے کتنا زیر بار احسان کیا

مولانا عرشی سے بھی صحبتیں رہیں اور حد درجہ پر لطف، مولویوں کے طبقہ میں مولانا عرشی کی واحد ذات ایسی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اپنی محبت سے مجھے کافر بھی بنا سکتے ہیں خواہ اس کا نام ان کے نزدیک اسلام ہی کیوں نہ ہو ـــ لیکن شکر ہے کہ وہ اس کی زیادہ کوشش نہیں کرتے اور میں جب کبھی ان سے ملتا ہوں تو کسی نہ کسی طرح اپنا ایمان سلامت لے ہی آتا ہوں۔ افسوس ہے کہ تنگی وقت کی وجہ سے سرکاری کتب خانہ نہ دیکھ سکا جہاں مولانا عرشی ایک ناظم کی حیثیت سے بیش بہا علمی خدمت انجام دے رہے ہیں

عزیزم ساحل بلگرامی کے مکان پر مولانا شاداں بلگرامی سے بھی ملاقات ہوئی جو مشہور دہریہ و ملحد ہیں اور یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ مولویوں کی پھٹکار سے انسان کا چہرہ کتنا نورانی ہو جاتا ہے۔ باوجود کبرسنی کے وہ اب بھی اپنی علمی و ادبی خدمات میں مصروف ہیں اور ایک مخصوص فضائے علم و ادب ان کی ذات سے وابستہ ہے۔ مولانا اولاد حسین بھی اس صحبت میں شریک تھے لیکن افسوس ہے کہ کسی ضروری کام سے دفعتاً انھیں چلا جانا پڑا اور تمام باتیں دل کی دل ہی میں رہ گئیں۔ اسی شام کو سید ابن علی صاحب کے مکان کی مختصر سی صحبت بھی یاد رہے گی۔ یہ فن موسیقی کے ماہر ہیں اور انھوں نے اپنی ذہانت سے بعض نئے ساز ایسے ایجاد کئے ہیں جن کو دیکھ کر ان کی ذہانت کی داد دینا پڑتی ہے

میں تھوڑی دیر کے لئے رامپور کے اس مخصوص حصہ میں بھی گیا جہاں کی گلیوں میں خدا جانے کتنے رات دن گنوائے تھے اور محمود علی صاحب نے جس

محبت سے میرا خیر مقدم کیا، اس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا، یہیں اُس شوخ و شریر لڑکے سے بھی ملاقات ہوئی جسے اب محمد حسن خاں کہتے ہیں۔ ان کی باتوں نے ماضی کی وہ یاد پھر تازہ کردی جسے میں بھلا چکا تھا اور جب میں وہاں سے لوٹا تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔

۴ر فروری کی شام کو اسلم خانصاحب کی معیت میں مجھے اس اجتماع کے دیکھنے کا بھی اتفاق ہوا جو قومی محاذ جنگ کی تحریک کے سلسلہ میں یہاں منعقد ہوا تھا۔ میں اس جلسہ میں ہزاروں انسانوں کا اجتماع دیکھ کر حیران رہ گیا، کیونکہ برٹش انڈیا میں تو اس قسم کے ادارے دس بیس آدمی بھی بمشکل جمع کرسکتے ہیں۔ چیف منسٹر صاحب سے جو میرے پاس ہی تشریف فرما تھے میں نے اپنی اس حیرت کا اظہار کیا تو انھوں نے فرمایا کہ رامپور میں اس تحریک کی کامیابی کا راز یہ ہے کہ یہاں یہ ادارہ بالکل غیر سرکاری حیثیت رکھتا ہے اور رامپور کی پبلک میں خود یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ انھیں خود اپنا قومی محاذ طیار کرنا چاہیئے۔ انھیں کی زبانی یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کامیابی میں بڑا ہاتھ اسلم خانصاحب کا ہے، جو اس ادارہ کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ اس جلسہ میں کچھ نظمیں پڑھیں گئیں چند تقریریں ہوئیں اور ان میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو ضمیر انسانی پر بار ثابت ہوتی

اُس رامپور سے جسے میں نے اپنے عنفوان شباب میں دیکھا تھا، اس وقت کے رامپور کو میں نے بہت مختلف پایا، اُسوقت کا رامپور صرف "دارالسرور" تھا اور اب وہ "دارالعمل" بھی نظر آتا ہے، متعدد صنعتی کارخانوں نے یہاں کی اقتصادی حالت کو بہتر بنا کر، اور جدید آئین حکومت نے ذہنی ترقی کے لئے نئی راہیں کھول کر، یہاں کی فضا کو بالکل بدل دیا ہے، جو مستقبل کے اور بہت سے شاندار امکانات کا پتہ دیتی ہے

ایک مختصر سی صحبت میں مجھے یہاں کے بعض نوجوان شاعروں کے کلام سننے کا بھی اتفاق ہوا اور یہ معلوم کرکے مجھے بہت خوشی ہوئی کہ شعرا رامپور کے رنگ تغزل میں عام طور پر ایک وزن ہے، مفکرانہ سنجیدگی ہے اور دوسرے مقامات کے عام شاعرانہ سطح سے ان کی سطح بہت بلند ہے۔

مجھے یہاں مولانا عبدالسلام خاں صاحب سے بھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اپنے علم و فضل کے لحاظ سے مخصوص امتیاز کے مالک ہیں اور سوائے علمی خدمت کے ان کا اور کوئی مشغلہ نہیں اور یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ ان کی اہلیت سے کوئی فایدہ نہیں اُٹھایا جاتا۔ ضرورت تھی کہ انھیں پوری فراغت کے ساتھ علمی تحقیق کا موقعہ دیا جاتا اور وہ اُن جواہر ریزوں کو وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہتے جو یہاں کے کتب خانہ میں چھپے ہوئے ہیں

میں خالد کا ذکر قصداً نہیں کرتا کیونکہ اُن کی جانبازیوں اور دلنوازیوں کی داستان بیان کرنے کے لئے کافی وقت چاہیئے

اخیر میں مجھے ایک بات اور کہنا ہے اور صرف اسلم صاحب سے۔ وہ یہ کہ اگر کبھی اُس

"سراپائش زیارتگاہِ مستاں"

سے ملاقات ہو، تو کہدیں کہ باوصف اس بیگانگی کے بھی

یادِ کسے بخاطر ناشاد می رسد!

مطبوعات طاق بستاں

خواب کی دُنیا: - اس موضوع پر یہ کتاب آخری لفظ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر آپ کو بھی اس عالم سے دلچسپی ہے تو اس کتاب کو ملاحظہ فرمایئے۔ جس میں مولانا عبدالمالک آردی نے فریوڈ کی تحقیقات کو بہت سے مفید حواشی کے ساتھ اُردو میں پیش کیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ۔ علاوہ محصول

الہامات شاد: - شاد عظیم آبادی کے رتبہ شاعری سے ہر شخص واقف ہے لیکن ان کے کلام کا انتخاب مع ایک انتقادی و تاریخی مقدمہ کے دیکھنا چاہتے ہیں تو مولانا عبدالمالک کی اس تالیف کو ملاحظہ فرمایئے۔ قیمت ۸ر علاوہ محصول

اقبال کی شاعری: - یہ کتاب مولانا عبدالمالک کے زور قلم کا نتیجہ ہے۔ اقبال پر اُردو میں اس سے بہتر نقد و تبصرہ شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ اسکی مقبولیت کا ثبوت یہ ہے کہ اس کا پہلا اڈیشن ہاتھوں ہاتھ بک گیا۔ قیمت دس آنے علاوہ محصول

مقام محمود: - مولانا عبدالمالک کے ادبی و تاریخی مقالات کا مجموعہ۔ قیمت دو روپیہ۔ علاوہ محصول۔

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز

معنی نگاہا ۔ عطوفت نامہ، جسے "پیامِ جاں بخش" کہنا زیادہ موزوں ہے، کل پہونچا۔ تمام رات سوچتا رہا کہ جواب سوائے "شکریہ" کے اور کیا ہو سکتا ہے ۔ لیکن یہ چیز میرے احساس اور آپ کے لطف و کرم کو دیکھتے ہوئے اتنی فروتر ہے کہ کم از کم میں تو جرأت کر نہیں سکتا

میری زندگی کی داستان اس قابل نہیں کہ آپ سُنیں اور اگر ہو بھی تو اس سے زیادہ میں کچھ کہہ بھی نہیں سکتا

رخ کشودند و لب ہرزہ سرایم دادند!

مجھے نہیں معلوم کہ صوفیہ کے یہاں طے منازل و کشف حجابات کی کیا صورت و ترتیب ہوتی ہے، لیکن یہاں تو "لا الٰہ" کے ساتھ ہی تمام پردے نگاہوں سے اُٹھ گئے اور "الا اللہ" کہنے کی نوبت ہی نہ آئی

لوگ حقیقت کی جستجو "ہاں" میں کرتے ہیں اور میں "نہیں" میں ۔ وہ بہت ترقی کرتے ہیں تو "نفی ماسوا" تک پہونچتے ہیں اور یہاں ابتدا ہوتی ہے "نفیِ نفی" یا "ترکِ ترک" کی منزل سے

یقیناً یہ سب لغو و مہمل باتیں ہیں، اور سوائے مزخرفات کے کچھ نہیں، لیکن کیا کیا جائے طرباتِ "تقشف" کے جواب میں ان مہملات "تصوف" سے کام لینا پڑتا ہی ہے

آپ نے "زمانہ کی فرصت" کا ذکر کر کے میرے شوق میں اور زیادہ ہیجان پیدا کر دیا ۔ آپ کو شاید معلوم نہیں کہ

عشق ہر جامی رود مارا بہ ساماں می برد!

عمر کی ناپ سال و ماہ سے نہیں کیجاتی، بلکہ صرف ان چند ساعتوں سے جو "کسی کی یاد میں گزر جائیں" اور اس لحاظ سے مجھے کبھی زمانہ کی طرف سے کوئی شکایت پیدا نہیں ہوئی

قدرت کا احسان ہے کہ

دل جائے دیگرست و نگہ جائے دیگرست

کا گناہ مجھ سے کبھی سرزد نہیں ہوا، جو دیکھتا ہوں وہی سمجھتا ہوں اور جو سمجھتا ہوں وہی کہتا ہوں ۔ دوسروں کی آنکھیں خواہ وہ کتنی ہی اچھی کیوں نہ ہوں، اگر ایک کو دو دیکھتی ہیں تو میرے کس کام کی!

یہ آپ نے کیا غضب کیا کہ جو بات اُن سے نہ کہنے کی تھی وہی کہدی ۔ کسی کا دشمن ہو کر تو میں دشمنی کا اظہار برملا کر سکتا ہوں، لیکن محبت کرنے کے بعد میری زبان بالکل بند ہو جاتی ہے ـــــ نگاہوں کا ذکر نہیں

آپ کو خبر نہیں کہ اس سے قبل میرے ان کے معاملات میں کتنی پیچیدگیاں پیدا ہو چکی ہیں اور میں نے کس صبر و تحمل کے ساتھ انکی تمام کج ادائیوں کو برداشت کیا ہے ۔ اب آپ نے ان میں اور اضافہ کر دیا ـــــ!

میرا ارادہ تھا کہ انھیں ایک دن کے لئے بلاؤں گا، لیکن اب یہ بھی ممکن نہیں ۔ خود جانے کا سوال نہ اب ہے نہ پہلے کبھی تھا

اس لئے صورت صرف ایک رہجاتی ہے، وہ یہ کہ اس سچ کے ساتھ اب آپ ایک جھوٹ بھی بولیں - یعنی ان سے کہدیں کہ تقاضا شدید تھا اس لئے "بھوپال چلا گیا" — اس سے زیادہ اگر وہ کچھ پوچھیں بھی تو کہنے کی ضرورت نہیں - میں بے چینی کے ساتھ آپکے جواب کا انتظار کرونگا

کیوں صاحب

گلہ ہے ہم سے کہ تم ضبط گریہ کر نہ سکے
ہنسی جب آگئی تم کو کب اختیار رہا،

اس سے زیادہ بیکسی اور کیا ہوسکتی ہے کہ جب "ضبط نہ ہوسکنے" کا سوال پیدا ہوتا ہے تو میں اپنے گریہ کے مقابلہ میں آپ کی "ہنسی" کا حوالہ دینے کے سوا اور کچھ نہیں کہہ سکتا — ممکن ہے دُنیا اس کو صرف تفنن یا کھیل سمجھے، لیکن میں جانتا ہوں کہ اس "کمیڈی" میں کتنی ٹریجڈی پنہاں ہے - آپ کے لئے نہیں، میرے لئے — اور — اُن سب کے لئے جو محبت میں رونے کے سوا کچھ نہیں کرسکتے

آپ سے نہ اس سے قبل میں نے کبھی کوئی شکایت کی اور نہ اب اس کی جرأت کرسکتا ہوں، لیکن اس کے یہ معنے تو نہیں کہ آپ کے طرزِ عمل کی جھوٹی تاویلیں کرکرکے دل کو تسلیاں دینے کا حق بھی مجھے حاصل نہیں - اُف !

نہ خوفِ آہ بتوں کو نہ ڈر ہے نالوں کا
بڑا کلیجہ ہے ان دل دُکھانے والوں کا !

شکایت نامہ کا اتنا پیارا جواب ! گلۂ محبت پر یہ شرم و حجاب ! قیامت ہے قیامت !

تغافل کے گلے سُنکر جھکالیں تم نے کیوں آنکھیں
مرے شرمندہ کرنے کو ذرا بیباک ہونا تھا

میں آپ کی مجبوریوں سے واقف ہوں، لیکن یہ بھی جانتا ہوں کہ بغیر قصد و ارادہ کے آپ کس قدر خوبی کے ساتھ لوگوں کا دل دُکھا سکتی ہیں - پھر آپ وہ عذر کیوں پیش کریں، جو باوجود صحیح ہونے کے، دردِ دل کا مداوا نہیں ہوسکتا

آپ یہاں سے دہلی تشریف لے گئیں اور مجھے کوئی اطلاع نہیں دی، وہاں سے علیگڈھ آئیں اور مجھے بے خبر رکھا گیا، پھر مراد آباد، دیرہ دون اور خدا جانے کہاں کہاں پہونچیں، اور مجھ کو کوئی علم نہیں، یہاں تک کہ آپ کے پاؤں میں زنجیر پڑگئی اور اب آپ کو ہوش آیا کہ کوئی "نامرادانہ زیست کرنے والا" لکھنؤ میں بھی رہتا ہے !

میں نے عرض کیا کہ "ذرا تفصیل سے کام لیجئے" - آپ نے اس کے جواب میں صرف ایک "آہِ سرد" سے کام لیا اور خاموش ہو رہیں - یونتو بظاہر اس تمام داستان میں کوئی بات ایسی نہ تھی جو دُنیا کے لئے عجیب و غریب ہوتی، لیکن میرے لئے - اب کیا بتاؤں - یہ کیا تھا

ہزار دھیان کو ٹالا خیال آ ہی گیا

آپ کو تو شاید یاد نہ ہوگا، لیکن میں وہ ساعت کبھی نہیں بھول سکتا، جب آپ، میرے سامنے نگاہ جھکائے ایک پھول سے کھیل رہی تھیں اور میں خوش تھا کہ - آج میں نے اپنا دل — "خوں کیا ہوا دیکھا، گم کیا ہوا پایا" — پھر کیا ہوا - اس کا مجھے بھی ہوش نہیں -

بہرحال، اب کہ شوق و اجتناب کی تمام منزلیں ختم ہوکر ہم آپ دونوں پھر اجنبی ہوچکے ہیں، زخموں کو تازہ کرنا مناسب نہیں

یہ سب درست کہ تم بُت بھی ہو خدا بھی ہو
مگر نیاز کے قابل یہ دل رہا بھی ہو !

میں ۳ اور ۴ فروری کو رامپور میں تھا - آپ کا خط واپسی پر ملا - پہلے ملجاتا، تو شاید آپ سے قریب تر ہونے کا احساس مجھے حاضری پر مجبور کردیتا، لیکن اب ممکن نہیں - خدا حافظ

بنا چلا راکھ کا ڈھیر میں، بجھا چلا دل کو لیکن
بہت دنوں تک دبی دبائی یہ آگ اے کارواں رہیگی

باب الاستفسار

ترقی پسند لٹریچر

(جناب مشتاق احمد صاحب - علی گڈھ)

ہمارے رسایل اور کتابیں جس قسم کا ادب آجکل پیش کر رہے ہیں اُس سے آپ غالباً ناواقف نہ ہوں گے "ترقی پسندی" کے عنوان سے جو جنسی میلانات اور عریانیات کو جذبات کی دلدل بنایا جا رہا ہے، اُسے دیکھتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ موجودہ لکھنے والوں نے یا تو "ترقی پسندی" کے مفہوم کو سمجھا ہی نہیں اور یا اس قسم کے عریاں مضامین لکھ کر جذبات سفلی اُبھارنے سے اُنکا مقصد محض کسب زر ہے۔

یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ نئے لکھنے والوں میں سے بہت سے ایسے ہیں جنھوں نے یہ تجارت بہت قلیل سرمایہ سے شروع کی ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان کی تحریروں میں نہ کشادگی ہے اور نہ خلوص۔ اس کے علاوہ بہت سے ادیب تو ابھی تک اپنے فن کو اپنی ذات سے علٰحدہ بھی نہیں کر پائے ہیں۔ وہ مرد و عورت کے تعلقات پر قلم اُٹھاتے ہیں لیکن ایک خارجی، بے تعلق اور غیر صحت مندانہ نقطۂ نظر سے بحث کر کے اپنے بیان سے محض اپنی جنسیاتی بھوک کا اظہار چاہتے ہیں۔ غالباً عورت کے اعضاء کی لچکائی ہوئی تصویر ترقی پسندی کی دلیل نہیں ہے اور نہ ہی محض بھوک، افلاس، غلاظت و بیماری کو بیان کر دینے سے کوئی سماجی مسئلہ حل ہوتا ہے!

عرصہ سے ارادہ تھا کہ اس مفہوم پر آپ کی فاضلانہ رائے معلوم کروں۔ لیکن ہر کام کا حسب منشا پورا ہو جانا اپنے اختیار میں کب ہوتا ہے؟ بہرحال اب کہ مجھے آپ کی رائے کی پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے جرأت کر کے باب استفسار کھٹکھٹاتا ہوں اور متوقع ہوں کہ سایل کا جواب بلا کسی تعویق و اختصار کے مرحمت فرمایا جائے گا۔

(نگار) یہ سوال ایک سے زاید بار مجھ سے کیا گیا، اور میں نے کبھی اس کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اس لئے نہیں کہ میں "ترقی پسند" لٹریچر کا حامی ہوں، بلکہ محض اسلئے کہ لٹریچر اسوقت جس برزخی دور سے گزر رہا ہے، اس میں "غیر ذمہ دارانہ قسم" کی باتوں کا پایا جانا مستبعد نہیں ہے۔

آپ یونیورسٹی کے طالب علم ہیں، اور یقیناً آپ اس حقیقت سے بیخبر نہ ہوں گے کہ "Realism in Art & Literature" کا مطالبہ کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن Realism یا واقعیت کا مفہوم البتہ ہر زمانہ میں بدلتا رہا ہے یہاں تک کہ ایک زمانہ وہ تھا جب حقیقت نام تھا صرف اعتقاد کا اور بڑے سے بڑے جھوٹ کو واقعہ کہکر پیش کیا جاتا تھا۔ یا ایک زمانہ یہ ہے کہ حقیقت کے متعین کرنے میں ہم بسا اوقات اخلاقی بیرحمی اور ذہنی گندگی سے بھی گریز نہیں کرتے۔

دُنیا میں اس سے پہلے بھی آزاد طبیعتوں نے کبھی کبھی "سوسائٹی" سے بے نیاز ہو کر اس کا مفہوم متعین کیا تھا اور اب کہ سماج و مذہب کی بہت سی نامناسب بندشوں کے خلاف زیادہ شدید ردِ عمل شروع ہو چکا ہے، اس بے نیازی کو قدرتاً اور زیادہ بیباک صورت اختیار کرنا چاہئے،

"ترقی پسند لٹریچر" کے حامی "ادب برائے ادب" کے قایل نہیں ہیں بلکہ "ادب برائے حیات" کے مدعی ہیں اور اُصولاً یہ بات بُری نہیں ہے، لیکن عملاً ہمارے بعض ادیب حیات کا مفہوم ہی غلط سمجھتے ہیں اور اس لئے اُن کے ادب میں غلطیوں یا نامناسب جسارتوں کا پایا جانا قدرتی بات ہے۔

بقسمتی یہ بات میری سمجھ میں بھی نہیں آتی کہ ادب اور زندگی کے سوال کے ساتھ ہی، عورت کا خیال دل میں کیوں آئے اور اگر آئے بھی تو اس طرح کیوں کہ ہم اسکی عزت کرنے کی جگہ اس سے کھیلنے لگیں۔ اس مسئلہ پر میں نے جہاں تک غور کیا ہے، میں اس نتیجہ پر پہونچا ہوں کہ آزادی اور اشتراکیت جو اس زمانہ کی مشہور پیداوار ہیں، دونوں ابھی تک کھلونا بنی ہوئی ہیں اور ابھی تک ہم نے اُن کی صحیح راہ متعین نہیں کی۔

آجکل کے نوجوانوں میں عام طور پر یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ ہماری موجودہ اقتصادی و سیاسی مشکلات بے لاگ تنقید اور سوسائٹی کے فرق مراتب توڑنے

کے بعد ہی دور ہو سکتی ہیں اور ایک حد تک یہ خیال غلط نہیں ہے، لیکن نہ بے لاگ تنقید نام ہے بدتمیزی کا اور نہ فرق مراتب توڑ کر قومی کلچر کو فنا کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ آپ دیکھیں گے کہ خود روس میں جہاں کی تحریک اشتراکیت نے ہندوستان کے نوجوانوں میں ولولۂ انقلاب و آزادی پیدا کیا ہے، نہ لٹریچر میں وہ گھنونا پن پایا جاتا ہے جو ہمارے یہاں کے بعض نوجوان ادیبوں کے لئے باعث فخر ہے، اور نہ سوسائٹی میں "فرق مراتب" کے حدود کو توڑا گیا ہے۔ یہ کہنا کہ روس میں ایک مزدور اور انجنیر دونوں کی معاشرت یکساں ہے یا یہ کہ وہاں کی جنسی زندگی ادارۂ فحاشی سے زیادہ نہیں۔ حقیقت پر پردہ ڈالنا ہے۔

آزادی کا جذبہ اس میں شک نہیں، بڑا اچھا جذبہ ہے، لیکن تہذیب و اخلاق کی حدود سے گزر جانے کا نام آزادی نہیں ہے۔

آج کل نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ مرض عام طور پر پھیلا ہوا ہے اور ان کے یہاں آزادی نام ہے صرف دریدہ دہنی اور گندگی اچھالنے کا۔ ایکبار میں نے یونیورسٹی کے جلسہ میں دیکھا کہ طلبہ نہایت بدتمیزی سے ہر ہر شخص کا مضحکہ اڑا رہے تھے اور پروفیسروں اور عورتوں پر بھی کھلم کھلا آوازے کس رہے تھے اگر آزادی اور بے لاگ تنقید اسی کا نام ہے، اور یہی چیز ہمارے لٹریچر میں بھی پیدا ہوتی رہی تو یقیناً یہ انقلابی دور انسان کی آیندہ نسلوں کے لئے بہت خطرناک ثابت ہوگا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ جب موجودہ ہیجان میں کمی ہوگی تو یہ خس و خاشاک از خود دور ہو جائیں گے اور زیادہ سنجیدہ فضا ہمارے سامنے ہوگی۔

آپ نے یہ بالکل صحیح لکھا ہے کہ جنسی مسایل پر اس وقت کے بعض ادیب (جن میں بدقسمتی سے دو چار عورتیں بھی شامل ہیں) نہایت بدتمیزی کے ساتھ اظہار خیال کر رہے ہیں اور ان کی تحریر میں غلاظت و گندگی کا عنصر غالب ہے، لیکن آپ اس قسم کے لٹریچر کو "ترقی پسند لٹریچر" کیوں سمجھیں اور اس رنگ کے لکھنے والوں کو "ترقی پسند ادب" کا صحیح نمایندہ کیوں قرار دیں۔

ان کے علاوہ اور بہت سے لکھنے والے ایسے ہیں جو وقت کی ضرورت کا ساتھ دے رہے ہیں اور جو کچھ لکھتے ہیں پوری سنجیدگی و متانت کے ساتھ لکھتے ہیں۔ آپ ان کا مطالعہ کیجئے اور ان کو نظر انداز کیجئے۔ پانی کی سطح پر خس و خاشاک دیکھ کر تمام پانی کو گندہ سمجھ لینا مناسب نہیں۔

دی مغل لائن لمیٹڈ

مسلمانوں کی قایم کی ہوئی واحد جہاز ران کمپنی

تھوڑے تھوڑے وقفہ سے بمبئی اور کراچی سے عدن اور پورٹ سوڈان، جدہ اور سویز تک جہازوں کی روانگی کا معقول انتظام

سفری اور باربرداری کے جہازات بمبئی اور کراچی سے عدن۔ پورٹ سوڈان جدہ اور سویز تک

مسافر اور مال و اسباب لیجاتے ہیں، نیز بمبئی اور کراچی سے پورٹ لوئی اور ماریشس تک سفر کرتے ہیں،

تمام سروسیں اور تاریخیں بغیر کسی پیشگی اطلاع کے منسوخ کیجا سکتی ہیں

مزید تفصیلات کے لئے لکھئے:۔ ٹرنر مارلسن۔ اینڈ کمپنی لمیٹڈ ۱۶ بنک اسٹریٹ۔ بمبئی

مطبوعات موصولہ

تاریخ افکار و سیاسیات اسلامی

یہ تالیف ہے جناب عبدالوحید خاں صاحب بی۔ اے۔ ال۔ ال۔ بی کی جس میں انھوں نے اسلام کے نصب العین کی تشریح کرکے بتایا ہے کہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں کیا کیا تغیرات پیدا ہوئے اور ان تغیرات کے کیا اسباب تھے۔

یہ تالیف اپنے موضوع کے لحاظ سے جس قدر اہم ہے، اتنی ہی اہم اپنی ترتیب و تدوین کے لحاظ سے بھی ہے۔ فاضل مولف نے تاریخ اسلام کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس سے اس کتاب میں بحث نہ کی ہو اور یہ دیکھ کر میں بہت خوش ہوا کہ انھوں نے کہیں کہیں قدامت پرستی و تقلید کے قید و بند سے آزاد ہوکر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یونتو دُنیا کی تمام قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ دلچسپ ہے، لیکن ملت اسلامی کی تاریخ اس لئے بہت زیادہ دلچسپ ہے کہ اس کا آغاز و عروج دونوں حد درجہ ڈرامٹک تھا اور اس کا زوال بھی دوسری قوموں کے زوال سے جداگانہ حیثیت رکھتا تھا۔

اس کتاب میں تاریخ و سیاست کے ساتھ ساتھ مذہب کو کسی جگہ نظر انداز نہیں کیا گیا اور اسی لئے تفسیر، وحدیث، فلسفہ اور تصوف وغیرہ سبھی چیزوں کا ذکر اس میں آگیا ہے۔

مولف نے ظاہر کیا ہے کہ اس تالیف سے ان کا مقصود "حکومت الٰہیہ" کی تشریح ہے اور اس سے مراد ان کی یہ ہے کہ قرونِ اولیٰ کا اسلام ہی صحیح معنی میں "خدائی حکومت" تھا اور اسی پر کاربند ہونے کے بعد اب بھی مسلمان اپنے کھوئے ہوئے عروج کو واپس لاسکتے ہیں۔

جس حد تک عمل و ولولہ کا تعلق ہے فاضل مولف کا یہ نتیجہ نکالنا نادرست ہے لیکن اُس مذہب کو سامنے رکھ کر، جو عہد نبوی یا عہد خلافت میں پایا جاتا تھا، یہ حکم لگانا درست نہیں، کیونکہ دُنیا میں کوئی قوم محض اُصول بناکر ترقی نہیں کرتی، جب تک کوئی شخصیت ان اُصول پر چلانے والی نہ پیدا ہو، اور اگر آج کوئی شخصیت مسلمانوں کو اُبھارنے والی پیدا ہوئی تو یقیناً وہ اس مذہب کی پیداوار نہ ہوگی جو اب سے سیکڑوں سال پہلے پایا جاتا تھا۔ جس زمانہ میں اسلام نے ترقی کی اسوقت صرف نصاریٰ کے رہبانیین اور یہود کے "ربیون" سے تصادم تھا، لیکن آج علوم و فنون اور عملی سائنس کا مقابلہ کرنا ہوگا اور اس کا تعلق یقیناً "علم تفسیر و حدیث" سے ہے اور نہ اُن اُصول حکومت سے جو خلافت راشدہ میں قایم ہوئے تھے۔

یہ کتاب اتنی ذیلی مباحث پر مشتمل ہے کہ میں ان کا اجمالی ذکر بھی اس مختصر سے ریویو میں نہیں کرسکتا اور ظاہر ہے کہ ان سے ہر شخص اتفاق بھی نہیں کرسکتا لیکن بہ حیثیت مجموعی یہ کتاب بہت قابل قدر ہے اور اس کے فاضل مولف کی محنت و کاوش کی صحیح داد اسی وقت دیجا سکتی ہے جب آپ بالاستیعاب اسی کا مطالعہ کریں — یہ تالیف تقریباً ۶۰۰ صفحات کو محیط ہے اور کاغذ، کتابت اور جلد کی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے اس کی قیمت پانچ روپیہ کسی طرح زیادہ نہیں ہے۔ ملنے کا پتہ یہ ہے:- عبدالوحید خاں - ۹ - لاٹوش روڈ - لکھنؤ

شاد اقبال

سر مہاراجہ کشن پرشاد مرحوم اور ڈاکٹر اقبال کے مابین جو خط و کتابت ہوئی تھی، یہ اسی کا مجموعہ ہے، اس میں ۱۹۱۶ء سے ۱۹۲۵ء تک کے تقریباً تمام خطوط شامل ہیں جن کی تعداد ۱۰۰ تک پہونچتی ہے۔ مہاراجہ بہادر مرحوم مشہور خط لکھنے والوں میں سے تھے اور ہندوستان کا شاید ہی کوئی سربرآوردہ اہل قلم ایسا ہو جس سے مہاراجہ بہادر کی مراسلت نہ رہی ہو۔ اس لئے ڈاکٹر اقبال مرحوم سے ان کی خط و کتابت کوئی عجیب چیز نہیں ہے — ہم نے ان خطوط کو بالاستیعاب نہیں دیکھا، لیکن سرسری نگاہ ڈالنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ اگر یہ خطوط شایع نہ کئے جاتے تو بہتر تھا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر زور نے شاد عظیم آبادی کے کاتیب شایع کرکے شاد کی شخصیت کو نگاہوں سے گرایا تھا اور اب ان خطوط کو شایع کرکے انھوں نے اقبال کے ساتھ بھی وہی سلوک کیا۔

ڈاکٹر اقبال کے خطوط میں کوئی ایک خط بھی ایسا نہیں جسے ذرا بھی علمی یا ادبی اہمیت حاصل ہو، بلکہ ان کے مطالعہ کے بعد اقبال ہم کو نہایت معمولی